CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

Shamah Saram

(جملہ حقوق بحقِ پبلشرز محفوظ ہیں)

شمعِ حرم

ہندوستان کی مایہ ناز خواتین کے افسانوں کا مجموعہ

مُرتّبہ

راجہ مہدی علیخاں

پبلشرز

نرائن دت سہگل اینڈ سنز لوہاری دروازہ لاہور

بار دوم

قیمت ے ر

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

لالہ بلراج سہگل پروپرائیٹر نرائن دت سہگل اینڈ سنز لوہاری گیٹ لاہور نے شائع کی۔

اور دین محمدی پریس لاہور میں باہتمام

ملک محمد عارف خلیل پرنٹر چھپی

فہرست

۱۔ مہمانداری	حجاب امتیاز علی	۷
۲۔ عذرا باجی	حمیدہ سلطانہ	۲۱
۳۔ سفر کا مقصد	ز۔ ب	۸۱
۴۔ غم نصیب	سنتا چیٹرجی	۱۲۵
۵۔ بلی کی روح	مسز عبد القادر	۱۵۷
۶۔ شادی	عصمت چغتائی	۱۷۳
۷۔ اندھے کی لاٹھی	ڈاکٹر رشید جہاں	۱۹۱
۸۔ بھابی	مسز شانتی دیوی	۲۰۷
۹۔ وہ اسکی کون تھی؟	مسز شانتی دیوی	۲۲۹
۱۰۔ دلھن کا انتقام	سینتا چیٹرجی	۲۴۵

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اِنتساب!

نانی اماں مرحومہ کے نام

جو

ہمارے خاندان میں شمعِ علم روشن کرنے کے بعد ایک دن

یکایک شاہراہِ زندگی میں ہمارا ساتھ چھوڑ کر باغِ جنّت

کی مقدس وادیوں میں چھپ گئیں!

"مہدی علیخاں"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

تعارف!

"شمع حرم" ہندوستان کی اُن مایہ ناز افسانہ نگار خواتین کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جنکی ادبی خدمات کا ذکر ہندوستانی ادب کی تاریخ میں زرّیں حروف سے لکھا جائے گا۔

ایک وُہ زمانہ تھا جب تعلیم ہندوستانی عورت کے لئے باعث ننگ تصوّر کی جاتی تھی۔ اور جس عورت کو علم کا "ناگ" ڈس لیتا تھا، شریف خاندانوں کی بہو بیٹیاں اُسکے سائے سے بھی دُور بھاگتی تھیں اور مذہب کے نام نہاد پیرو کسی تعلیمیافتہ عورت کا نام سُنکر کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے۔ ایک یہ زمانہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی عورت تعلیم یافتہ ہندوستانی مرد کے دوش بدوش ملک و قوم کی خدمت کا بیڑا اُٹھائے ہوئے ہے اور "عورت ناقص العقل ہے" کا مقولہ دہرانے والے مردوں پر خود ناقص العقل ہونے کا گمان ہو رہا ہے۔

شمع حرم کے قارئین کی نظر سے اکثر مقتدر ہندوستانی افسانہ نگاروں کے افسانے گزرے ہونگے، کیا کوئی شمع حرم کو پڑھ کر کہہ سکتا ہے کہ ناقص العقل عورتوں کے یہ شاہکار صحیح العقل مرد افسانہ نگاروں کے افسانوں سے کسی بات میں کمتر ہیں؟ میں تو یہ کہونگا کہ شمع حرم کے اکثر افسانے ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناقص العقل عورت صحیح العقل مرد کو اس حریفانہ دَور میں ایک یا دو قدم نہیں بلکہ میلوں پیچھے چھوڑ گئی ہے۔

"شمع حرم" کے اکثر افسانے ایسے ہیں جن میں ہمارے ملک کے ناقص سماجی نظام کی یا تو ایک ہلکی سی ہنسی اُڑائی گئی ہے، یا سماج کی شقی القلبی کی ایک عبرت آموز تصویر دکھائی گئی ہے بعض افسانے انسانی فطرت کا ایک کامیاب تجزیہ ہیں اور بعض تفریحی، لیکن

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ہندوستانی ادب میں ان کا درجہ بھی بہت بلند ہے۔

کوشش کی گئی تھی کہ خواتین کی اس "مجلس" میں ہندوستان کے ہر صوبے سے کوئی نہ کوئی خاتون اپنے صوبے کی نمائندگی کرتے ہوئے شرکت آرا ہو لیکن افسوس ہے۔ کہ کتاب کا معیار بلند رکھنے میں یہ شرط کسی حد تک حائل ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ گنتی کے چند ایک صوبے اس معاملے میں بالکل کورے کے کورے تھے۔ لہٰذا اس محفل میں صرف وہی خواتین شامل ہو سکیں، جن کا درجہ ہندوستانی ادب میں بہت بلند تھا۔

"شمع حرم" کے تمام افسانے ایسے ہیں۔ جنہیں ہم مغربی زبانوں کے افسانوں کے مقابلے میں نہایت فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ اگر ان کا ترجمہ کر کے غیر ملکوں میں پہنچایا جائے تو تشنہ کامانِ ادب انہیں آنکھوں سے لگائیں۔ لیکن بدقسمت ہندوستان میں ان مایہ ناز ہستیوں کی کیا قدر ہو سکتی ہے۔

بعض افسانے ہندی اور مرہٹی سے ترجمہ کرائے گئے ہیں۔ جن کرمفرماؤں نے ان کا ترجمہ کر کے میرا ہاتھ بٹایا ہے میں اُن کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ میں جنابِ حامد علیخاں صاحب ایڈیٹر رسالہ "ہمایوں"، محترمہ کنیز فاطمہ صاحبہ حیا لکھنوی اور جنابِ نذیر یزدانی کی خدمت میں بخلوص تمام ہدیہ تشکر پیش کرتا ہوں۔ کہ انہوں نے ان افسانوں کو اُردو میں منتقل کیا، اس طرح کہ نقل اور اصل کی تمیز اٹھ گئی۔

جہاں تک میرا خیال ہے، ہندوستان میں افسانوں کا ایسا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ امید ہے کہ ہندوستان کے ہر گھرانے میں "شمع حرم" روشن نظر آئیگی۔

۳۰- جولائی ۱۹۴۱ء

راجہ مہدی علیخان

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

مہمانداری

"حجاب امتیاز علی"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

حجاب امتیاز علی

تعارف - آپ سید محمد اسمٰعیل (مرحوم) انڈر سیکرٹری اعلیٰ حضرت حضور نظام کی صاحبزادی اور ہندوستان کے مقتدر ترین ڈرامہ نگار جناب سید امتیاز علی صاحب تاج بی۔ اے کی اہلیہ محترمہ ہیں۔

حیدر آباد میں پیدا ہوئیں۔ ذوق ادب آپ کو اپنی والدہ محترمہ عباسی بیگم صاحبہ (مصنفہ زہرا بیگم) سے ترکے میں ملا۔ ابتدائی تعلیم کانونٹ میں اور اس کے بعد دینی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ ۳۰۔ مارچ ۱۹۳۴ء کو تاج صاحب سے آپ کی شادی ہوگئی۔

۱۹۳۶ء میں (یعنی ترکی کی مشہور مسلمان ہوا باز خاتون صبیحہ خانم سے بھی پہلے) آپ نے ہوا بازی کا لائسنس "اے" حاصل کیا۔ بہرحال اگر دنیا میں نہیں تو کم از کم سلطنت برطانیہ میں آپ پہلی مسلم ہوا باز خاتون ہیں۔ نغمۂ موت، ادبِ زرّیں، میری ناتمام محبت اور دوسرے رومان، لاش اور دوسرے ہیبت ناک افسانے، صنوبر کے سائے اور دوسرے رومان، خلوت کی انجمن اور ظالم محبت آپکی مشہور تصنیفات ہیں۔ تحفے اور دوسرے شگفتہ افسانے پر پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے آپکو ادبیات کا اوّل انعام مل چکا ہے۔ آپکا سٹائل ہندوستان کے تمام ادباء سے الوکھا اور خوبصورت ہے۔ اس قدر خوبصورت کہ بعض اوقات آپکی تحریر پر نثر کی بجائے نظم کا گمان ہونے لگتا ہے۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

مجھے ایک مدت سے سمرؔو کے کھنڈر دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ اتفاق سے ایک دن باتوں باتوں میں مَیں نے اپنے شوق کا ذکر بوڑھے ڈاکٹر گارؔ سے کیا۔ وہ سنتے ہی بولے ۔" اتنا اشتیاق ہے تو بیٹی وہاں کی سیر کو جائیں کیوں نہیں ، تمہارے قیام کا انتظام مَیں کئے دیتا ہوں۔ مادام حمرؔہ دلی خوشی سے تمہیں اپنا مہمان بنائینگی کہو تو آج ہی اُنہیں خط لکھ دُوں ؟"

" مادام حمرؔہ کوُن ہیں ؟" مَیں نے سوال کیا۔

بوڑھے ڈاکٹر گارؔ نے نسوار کی ڈبیا پتلون کی جیب سے نکالی اَور اس پر اُنگلی مارتے ہوئے بولا ۔" تم مادام حمرؔہ کو نہیں جانتیں رُوحی ؟ دو سال ہوئے یہ خاتون سمرؔو سے کوئی چالیس میل کے فاصلہ پر کار کے حادثہ میں بُری طرح زخمی ہوگئی تھیں۔ اتفاق کی بات ، اُسی زمانہ میں ہماری پارٹی شکار کی غرض سے نکلی ہوئی تھی ، خیمے قریب ہی لگے ہوئے تھے ، رات کا وقت تھا۔ شہر دُور تھا ، ایک میں ہی تو ہاں ڈاکٹر تھا۔ اللہ نے وقت پر مجھے توفیق دی اَور مَیں اُس بیچاری خاتون کو اپنے خیمے میں اُٹھا لایا۔ چوٹیں سخت آئی تھیں۔ مگر چار دن کی تیمارداری اَور علاج نے خطرے سے باہر کر دیا۔ اَور مَیں نے اُنہیں اپنی کار میں بٹھا کر ان کے گھر

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

پہنچا دِیا۔ وُہ دِن اَور آج کا دِن ——— ہمیشہ اُن کا اصرار رہا۔ کہ مَیں کچھ دِن کے لِئے اُن کے ہاں جاؤں اَور اُن کا مہمان رہوں، مگر باوجود اس بچاری کے اِس شدید اصرار کے مَیں اُدھر ابتک نہ جا سکا۔ نہ کھنڈروں کی سَیر کے لِئے وقت نکال سکا۔ بیماروں کی خدمت سے جو وقت بچتا تھا، وُہ مطالعہ کی نذر ہو جاتا تھا۔ اب یہ موقع اچھا پیدا ہو گیا ہے۔ اپنی بجائے مَیں تمہیں بھیج دونگا۔ انہیں خوشی ہوگی۔ اَور تمھاری ضرورت پوری ہو جائے گی۔"

یہ سن کر مَیں بولی۔ "واقعی موقع تو اچھا ہے، مگر ڈاکٹر مَیں اکیلی نہیں جاتی سچ مُچ مجھے لطف نہ آئے گا۔ تم بھی ساتھ چلو۔"

ڈاکٹر نے اپنے قدیم انداز میں صاف انکار کر دیا۔ "نہ بیٹی میرا جی نہیں چاہتا۔ کَون سوٹ کیس بھرے اَور سفر کی زحمت اُٹھائے۔"

جسوتی برآمدے کے سِرے پر بیٹھی میوہ کھا رہی تھی۔ یہ سنکر وہیں سے بولی۔ "سُوٹ کیس مَیں بھر دُوں گی، پیارے گار! آپ ضرور چلیں۔"

جسوتی بچپن ہی سے بوڑھے ڈاکٹر گار کو گار، گار ہی کہنے کی عادی ہے ڈاکٹر گار نے تھوڑی دیر کے غور کے بعد اپنی عادت کے مطابق ارادہ بدل ڈالا۔ بولا۔ "تم لوگوں کی فرمائش ٹالتے ہوئے بھی طبیعت آزردہ ہوتی ہے، تو پھر جسوتی! میرے سوٹ کیس تمکو بھرنے ہونگے اَور میری نسوار کی پڑیوں کی دیکھ بھال رُوحی تم کرو!"

بوڑھے ڈاکٹر کی اسی ایک گندی عادت سے مجھے نفرت ہے، مجھے نسوار کو چھُونے سے بھی گھن آتی ہے، مگر کیا کرتی، اِس وقت مطلب اپنا تھا۔ ناچار وعدہ کر لیا کہ نسوار کی پڑیوں کا اہتمام مَیں کر لوں گی۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ڈاکٹر گار نے اسی وقت مادام حمرہ کو خط لکھ دیا۔ کہ ہفتہ عشرہ میں وہ ہم لوگوں سمیت وہاں پہنچ رہے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر کے پاس بعض کیس ایسے اہم آتے رہے کہ خط لکھنے کے پندرہ دن بعد ہم اپنا سفر ختم کر سکے۔

اس روز میں، میری محبوب اکلوتی سہیلی جسوتی اور ڈاکٹر گار ہم تینوں ڈاکٹر کی چھوٹی سی سفری کار میں چل پڑے۔ دن کی گرمی سے بچنے کیلئے رات کا کھانا کھا کر سفر شروع کیا گیا۔ پروگرام یہ بنا کہ سمرو کے راستے میں رات مادام حمرہ کے ہاں بسر کر کے انکی خوشی پوری کریں اور دوسری صبح سمرو کے کھنڈروں میں پہنچ جائیں۔ یہ خبر نہ تھی کہ یہ رات زندگی کی نہایت خطرناک راتوں میں سے ایک ہوگی —— مالک کی پناہ!

ماہ مئی کی تپتی ہوئی چاندنی رات تھی۔ ہماری ننھی سی "بنٹ لے" ویران سڑک پر کسی تیز رفتار کیڑے کیطرح چلی جا رہی تھی۔ نو بج چکے تھے۔ خیال تھا کہ بارہ ساڑھے بارہ بجے تک ہم مادام حمرہ کے ہاں پہنچ جائیں گے۔ سڑک پر کوئی راہگیر نہ تھا۔ زرد چاند موسم گرما کے شفاف آسمان پر دم بخود تھا۔ تاڑ کے فلک بوس چھتری نما درخت رات کی فسوں کاری سے مبہوت کھڑے تھے۔

جسوتی کار چلا رہی تھی۔ میں اُس کے پہلو میں بیٹھی ٹافی کھا رہی تھی۔ بوڑھا ڈاکٹر بجھا ہوا سگار منہ میں دبائے غنودگی کے عالم میں پچھلی سیٹ پر پڑا تھا۔ وہ غنودگی سے چونکتا تو مزے میں آ کر عمر خیام کی کوئی شوخ سی رباعی اپنی غیر شاعرانہ موٹی آواز میں گا دیتا۔ یہ اُسکی مخصوص عادتوں میں سے ایک عادت تھی۔

دلفریب چاندنی تھی اور خوابناک سماں، دفعتہً جسوتی نے کار کھڑی کر دی۔

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے چاکولیٹ کا ایک ٹکڑہ نگلتے ہوئے پوچھا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

وہ بولی۔ "کوئی خرابی رُوحی!" اَور پھر سیٹ سے اُتر کر انجن کھول کر دیکھنے لگی۔

مَیں نے کہا۔ "ناممکن"۔ اچھا ٹھہرو مَیں دیکھتی ہوں"۔ یہ کہہ کر مَیں نے اپنا دستی بٹوہ ڈاکٹر گار کی گود میں پھینک دیا اَور خود انجن کو دیکھنے لگی۔ آدھے گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد ہم نے مایوس ہو کر ایک دوسرے کو تکا۔

" اَب کیا ہوگا رُوحی"؟ جسوتی نے کھسیانے لہجہ میں پوچھا۔ اُسی وقت تاڑ کے دیوقد درخت پر تہذیب وتمدن سے ناآشنا صحرائی اُلّو نے ایک وحشیانہ چیخ ماری۔ بھلا جسوتی کے کان جو ستار کی موسیقی اَور محبت کی شیریں سرگوشیوں کے عادی تھے۔ اُلّو کی اس زیادتی کی تاب کب لاسکتے تھے۔ وہ مارے خوف کے مجھ سے چمٹ گئی۔ لیکن میں تو غیر زمینوں اَور تھاوری جیسے دشوار گزار پہاڑوں کی سیاحت کی عادی ہوں۔ اِسلئے اس کی بُزدلی پر اس کو ہمّت دِلائی۔

اِتنے میں بوڑھا ڈاکٹر گار حافظؔ کا ایک عشقیہ شعر پڑھتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ اَور پُوچھنے لگا۔ "کیا ہم پہنچ گئے"؟

کچھ دیر بعد پریشانی کے عالم میں ہم تینوں کار سے نیچے اُتر آئے اور سراسیمگی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

رات زیادہ گھری ہوتی چلی جاتی تھی۔ چاند کی زرد روشنی میں رات کا کوئی پرندا اپنے بڑے بڑے بازو پھیلائے کسی سمت اُڑتا تو ہم کسی راہگیر یا گاڑیبان کے دھوکے میں اسی سمت تکنے لگتے۔

بہت دیر بعد دُور سے بغیر چھت کے دیہاتی وضع کی ایک مضحکہ انگیز گاڑی

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

آتی ہوئی نظر آئی۔

جسونتی نے اُسے دیکھ کر غمگین لہجہ میں کہا۔ "اگر ہم دیر سے پہنچے۔ تو وُہ سو چکی ہو نگی۔ اِس لیئے اِس گاڑی میں چلے چلو"۔

گاڑی سڑک کے کنارے بے فکری سے جیسے چہل قدمی کرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

ڈاکٹر گارنے دُور سے آواز دی۔ "بڑے میاں! "ایوب محلہ" میں "عشرت خانہ" نامی کوٹھی تک ہمیں پہنچا دو گے"؟

گاڑیبان نے ہماری طرف دیکھے بغیر وہاتیوں کے سے اکھڑ لہجہ میں جواب دیا۔ "نہیں بارہ بج گئے ہیں، دیر ہو چکی ہے"۔

یہ خلافِ تہذیب اُور ٹکا سا جواب سُن کر بہت ہی غصہ آیا۔ ضبط کر کے مَیں اُور جسونتی اس کے پاس گئیں۔ وُہ ہمارے بیش قیمت زریں لباس اُور باوقار چہرے دیکھ کر گاڑی سے نیچے اُتر آیا۔

"یہ لو ـــــ" مَیں نے جاتے ہی چاندی کا ایک چمکدار سکّہ اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ اُور بولی۔ "اب ہمیں جلدی سے "عشرت خانہ" تک پہنچا دو"۔

وُہ مرعوب ہو گیا۔ اور مؤدب لہجہ میں بولا۔ "سوار ہو جایئے حضور دو گھنٹے میں پہنچا دوں گا"۔

گاڑی کے پائیدان پر قدم رکھا۔ تو ایسا معلوم ہُوا۔ کہ گاڑی سر پر آ رہے گی۔ اسلئے فوراً مَیں نے اس کی چھت تھام لی۔ جسونتی نے اس کے پہیئے کو مضبوطی سے پکڑ کر گاڑی پر قدم رکھا۔ غرض ہم تینوں چڑھ کر بیٹھ گئے۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اب گاڑی چلی جا رہی تھی آہستہ آہستہ، جیسے کسی جاں بلب مریض کا سانس چل رہا ہو۔ چاند زرد پڑ گیا تھا۔ اور ہواؤں میں خوفناک سرسراہٹ پیدا ہو گئی تھی۔

بوڑھا ڈاکٹر گارہ گاڑی کے ہچکولوں سے ناخوش اور چڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہم دونوں گرمی سے نڈھال، ہاتھوں میں خس کی زرّیں پنکھیاں جنکی ڈنڈیاں خوشبودار صندل کی لکڑی کی تھیں، بار بار بے کلی سے پہلو بدل رہی تھیں، آہ اللہ! وہ گرم اور ویران چاندنی رات، سانس آگ کے شعلوں کی طرح ناک سے نکلتا تھا۔ زبان سوکھے پتے کی طرح خشک تھی۔ جسوتی رہ رہ کر اپنی پری کی وضع کی چھوٹی سی نقرئی صراحی سے پانی انڈیل انڈیل کر پی رہی تھی۔ مشرقی ممالک کی یہ وہی گرم رات تھی جس کے متعلق ہمارے ان ایشیائی ممالک میں مشہور ہے کہ سبز چشم پریاں بھی اپنی آبی دنیا سے باہر نکل آتی ہیں۔

دور سے ایک سفید شاندار عمارت نظر آنے لگی۔ پھر یکلخت بوڑھا ڈاکٹر گار گارڈی بان پر، اور میں جسوتی پر جا پڑی۔ اور اس طرح ہماری مضحکہ انگیز گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ عشرت خانے کے ایک شاندار پھاٹک میں مڑ گئی۔

میں نے روتے لہجہ میں کہا۔ "ایسی بھدی گاڑی میں اپنے میزبان کے سامنے جاتے ہوئے میں تو زمین میں گڑ جاؤنگی"۔

اس پر بوڑھے ڈاکٹر گارہ نے کہا۔ "مگر روحی! اس میں شرم کی کیا بات ہے؟ کیا وہ سمجھ نہ جائیں گی۔ کہ مجبوری کو اس گاڑی میں سوار ہونا پڑا ہوگا"۔

جسوتی نے کہا۔ "نہ نہ جتنی جلدی ہو سکے اس کو واپس کر دو"۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

چاندنی کی سفید دھاریں خوش قطع اور رنگ روشوں پر پڑی ہوئی تھیں ہماری گاڑی صدر دروازے پر جا کر رک گئی۔ ہم نے فوراً اسے واپس کر دیا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ "یہاں کی دُنیا تو خواب میں ملفوف نظر آتی ہے۔ چوکیدار کا بھی پتہ نہیں۔"

جسونتی نے کہا۔ "کون جانے مادام ٹھمرو یہاں ہیں بھی یا نہیں؟"

ڈاکٹر کہنے لگا۔ "ہونگی کیوں نہیں؟ انہوں نے میرے خط کا جواب دیا تھا کہ میں دلی اشتیاق سے آپ سب کی آمد کی منتظر رہوں گی۔"

ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا، پہلے احتیاط سے آہستہ آہستہ، پھر کچھ دیر بعد زور زور سے۔ مکان کا طواف کیا۔ نوکروں کو پکارا۔ چوکیداروں کو آوازیں دیں، غرض جتنی کوششیں ہو سکتی تھیں کر لیں۔ مگر زرد چاندنی میں سفید مجرابوں والا عالیشان محل ساکت کھڑا رہا۔ وسیع برآمدوں میں لمبے لمبے ستونوں کا عکس چاندنی میں ترچھا پڑ رہا تھا۔ چمبیلی کی بیل میں جھینگر اپنا نغمۂ تنہائی الاپ رہا تھا۔

جب مایوس ہو کر ہم لوگ زینے سے اُترنے لگے۔ تو اچانک اندر کسی کمرے سے ایک ایسی آواز آئی جیسے کسی نے دیا سلائی جلائی ہو۔

ڈاکٹر گار نے چونک کر کہا۔ "ٹھہرو، میرا خیال ہے کہ کوئی جاگ اُٹھا!"

ہم تینوں پھر زینے طے کر کے دروازے کے پاس اس امید میں جا کھڑے ہوئے کہ اب کھلتا ہے اور اب کھلتا ہے۔ اندر سے کبھی کبھی کوئی خفیف سی آواز آ جاتی تھی، پانچ منٹ اسی حالت میں گزر گئے، ہم بند دروازے پر نظریں گاڑے کھڑے رہے۔

آخر ڈاکٹر نے حیران ہو کر کہا۔ "یہ کیا بات ہے؟"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

میں نے شیشوں میں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی، وہاں سوائے تاریکی کے کچھ نہ تھا۔

ڈاکٹر بیزار ہو کر چلّایا۔" ارے بھئی یہاں کوئی ہے بھی؟"

اُس کے چلانے کا یہ اثر ہوا کہ اندر پھر کچھ گڑبڑ سی ہونے لگی۔ دو لمحہ بعد یکایک دروازہ اِس زور سے کھلا کہ ہماری آنکھیں بند ہو گئیں۔ اُس کا کھلنا تھا۔ کہ تیز و تند ہوا کا ایک سرد جھونکا اچانک ہمارے گرم چہروں سے آکر لگا جیسے کسی نے تھپیڑ مارا ہو۔ میری تو آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور ساتھ ہی ہم تینوں کھڑے کھڑے کانپ سے گئے۔ لیکن دروازے کے سامنے موجود کوئی نہ تھا۔

ڈاکٹر گار حیران اور پریشان ہو کر بولا۔" یہ دروازہ کھولا کس نے؟"

—— اندر کی ویران تاریکی میں داخل ہونے کی ہمت نہ ہوئی۔ ڈاکٹر نے ایک قدم اندر رکھا تھا کہ جنوتی نے اُسے روک دیا۔ بیزار ہو کر ہم نے پھر باغ کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ یکلخت پھر اندر کے کسی دروازے کے پٹ سے کھلنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی سرد اور تند ہوا کا جھونکا ایک بار پھر ہم تک پہنچا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تاریکی میں ایک ہلکی سی روشنی نظر آنے لگی جو بتدریج موم بتی میں تبدیل ہو گئی۔ ہم نے موم بتی سے ذرا اوپر کو نگاہ اُٹھائی تو اٹھائیس انتیس سال کی ایک حسین اور دلفریب خاتون نظر آئی۔ جس نے نہایت سادہ اور سفید لمبے لمبے لرزاں دامنوں کا لباس پہن رکھا تھا۔ موم بتی اُس کے ہاتھ میں تھی۔

ڈاکٹر گار کو دیکھ کر وہ مسکرائی اور سر جھکایا۔

"مزاج شریف مادام حمزہ —— یہ دونوں لڑکیاں میری بیٹیاں ہیں۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

انہیں کا ذکر میں نے خط میں کیا تھا۔"

خاتون حمیرہ نے نہایت دلکش انداز میں ہماری طرف دیکھ کر خیر مقدم کے طور پر سر جھکایا۔ پھر ایک لمحہ بعد بغیر کوئی بات کئے انہوں نے اشارے سے ہمیں اپنے پیچھے بلایا۔ اور روشنی دکھاتے ہوئے خود سامنے چلنے لگیں۔ ایک بل کھائے ہوئے ناگ کے پھن پر موم بتی جل رہی تھی۔ ہوا سے ان کے سفید لمبے لمبے دامن ان کے پیچھے دُور دُور تک لہرا رہے تھے۔ چال ایسی تھی۔ جیسے کوئی پری ہوا میں تیر رہی ہو۔ سیاہ بال، سفید ریشمی چادر کے نیچے ہوا کی شوخیوں سے لہرا رہے تھے۔ چہرے پر حوروں کی سی مسکراہٹ تھی۔

اسی وقت جسونتی نے سرگوشی کی "روحی! یہاں کیسی خنک ہوا چل رہی ہے باہر تو سڑکوں پر لو کی تکلیف رہ لپٹوں سے ہمارے چہرے گرم ہو رہے تھے۔"

جسونتی کا فقرہ ختم ہوا ہی تھا کہ ہم ایک عالیشان ہال میں پہنچے جہاں ایک سیاہ لمبی، اعلیٰ پالش کی ہوئی چمکیلی میز پر انواع و اقسام کے پھل برگ نما نقرئی طشتریوں میں سجے ہوئے تھے۔ دل کی شکل کی ننھی ننھی کٹوریوں میں شربت رکھا ہوا تھا۔ میز کے اوپر چھت میں کنول کے پھولوں کی وضع کے فانوس آویزاں تھے۔ دیواروں پر ارغوانی رنگ کے زریں پردے لگے ہوئے تھے اور کسی قدیم جنگ چین کے مناظر لٹک رہے تھے۔

مادام حمیرہ نے سانپ کی شکل کا شمع دان میز پر رکھ دیا اور خود سرے والی میز پر بیٹھ گئیں۔

"لیکن" ڈاکٹر گارنے کہا "میری پیاری مادام ——— رات کے دو

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

مجھے ایسی لذیذ میز سے کوئی کس طرح لطف اندوز ہو سکتا ہے ؟ اِس وقت تو ایک نرم آرام دِہ بستر عنایت ہو جائے تو بڑی مہربانی ہو۔"

یہ سنتے ہی مادام حمرہ بغیر کسی قسم کا کوئی لفظ منہ سے نکالے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ کھانے کے لئے مطلق اصرار نہ کیا۔ اپنا وُہی ناگن کی وضع کا شمعدان اٹھا لیا۔ اور مسکرا کر گردن کے اشارے سے ہمیں اپنے پیچھے پیچھے آنے کو کہا۔

ایک پُرتکلف خوابگاہ میں جہاں مدھم روشنیوں کے نیچے نفیس اور رنگین ریشمیں بستر بچھے ہوئے تھے لے گئیں۔ یہاں پہنچ کر سر کے اشارے سے ہمیں شب بخیر کہا اور چپ چاپ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی اسی طرح باہر چلی گئیں۔

مَیں ایک کمزور دِل کی وہمی سی عورت ہوں۔ اپنی میزبان کی اِن حرکات نے میرا خون خشک کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کے کمرے سے باہر جاتے ہی میں نے ڈاکٹر گار کا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔ "یہ بات کیوں نہیں کرتیں ؟"

گار بولا۔ "میں خود حیران ہوں، نہ جانے کیا معاملہ ہے۔"

"یہاں سے بھاگ چلو ڈاکٹر!" مَیں نے بیزار لہجہ میں کہا۔

جسونتی بولی۔ "ان کی کیسی میٹھی شکل ہے، پر کہیں گونگی تو نہیں ؟"

ڈاکٹر گار نے کہا۔ "نہیں بیٹی نہیں، وُہ بے حد باتونی ہیں۔"

مَیں سوچتے ہوئے بولی۔ "باوجود ان کے حسن کے انہیں دیکھ کر مجھے دہشت سی معلوم ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر گار اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جسونتی اور مَیں اِس راز کو سلجھانے کی کوشش کرتی ہوئی کوئی تین بجے کے قریب اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹ گئیں۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

صبح کی عبادت کے وقت عادتاً میری آنکھ کھل گئی۔ پروگرام کے مطابق آٹھ بجے ہمیں سمرو کے کھنڈروں کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔ اس لئے میں نے جسونتی کو بھی جگا دیا۔ ہم دونوں نے نماز پڑھی، صبح گرم اور خوش گوار تھی، نماز کے بعد سامنے چنبیلی کی بیلوں میں بیٹھ کر بہت دیر تک چائے کا انتظار کیا۔ مگر جب مایوسی ہوئی تو میں ڈاکٹر گار کے کمرے میں گئی اور بولی۔ "ڈاکٹر، ابھی تک سو رہے ہو؟"

وہ بولے۔ "چائے کے انتظار میں پڑا ہوں روحی! چائے آجائے تو اٹھوں۔ ذری وہ نسوار کی ڈبیا پکڑا دینا۔ شکریہ!"

نو بج گئے۔ اور کسی نے خبر نہ لی تو میں نے کہا۔ "چلئے ڈاکٹر ذرا باہر نکل کر دیکھیں۔ چائے یا کوئی خادمہ کیوں نہیں آئی؟"

ڈاکٹر گار نے جلدی جلدی کپڑے پہن لئے۔ ہم تینوں وسیع برآمدے سے گزر کر بڑے ہال میں آئے۔ تمام دروازے بند تھے، ہر طرف سناٹا اور ویرانی تھی۔ بیش قیمت فرنیچر پر گرد تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ کوٹھی کئی روز سے بند پڑی ہے۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے کھنکار کر آہستہ آہستہ ایک ایک کمرے کو کھولا۔ لیکن ہر کمرہ خالی تھا۔۔۔ ہر کمرے کے سامان کی یہ حالت تھی، جیسے برتا نہیں گیا، منگوا کر رکھ دیا گیا ہے۔

ساری کوٹھی دیکھ ڈالی، اس میں کہیں کوئی متنفس نہیں تھا۔ ہمارے دلوں پر دہشت ایک بوجھ کی طرح بیٹھنے لگی۔ پریشان ہو کر باہر باغ میں نکل آئے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا یہ راتوں رات کیا ہو گیا۔۔۔؟

نوکر کدھر ہیں۔۔۔؟ مادام حمزہ کہاں غائب ہو گئیں؟

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

دس بجنے کو آئے، ہم پریشانی کے عالم میں اس ویران گھر کے زینے پر کھڑے سوچ رہے تھے کہ کیا کریں۔ اتنے میں دیکھا کہ بوڑھا ملازم باغ سے ہو کر اندر آیا۔ اور چپ چاپ ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ پھر اس نے فرنیچر نکال نکال کر باہر رکھنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی وہ زور زور سے روتا بھی جا رہا تھا۔

ہم لوگ تیزی سے اس کی طرف گئے۔ وہ ہمیں دیکھ کر ٹھٹک سا گیا۔ اور پھر حیران ہو کر ہمارا منہ تکنے لگا۔

ڈاکٹر گار نے پوچھا —— "مادام حمرہ کہاں ہے؟"

بوڑھا متعجب ہو کر دیوانوں کی طرح ڈاکٹر کا منہ تکنے لگا۔

ڈاکٹر گار نے پھر کہا "ہم انکے مہمان ہیں، مادام حمرہ کہاں گئیں؟"

بوڑھے نے حیران ہو کر کہا۔ "مادام حمرہ؟ آہ حضور، بیگم صاحبہ کو تو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ انکے انتقال کو آج پورے دس دن ہو گئے۔ آج گھر کا سامان نیلام ہونے والا ہے۔"

یہ سنتے ہی میں نے اپنے جسم میں ایک پھریری سی محسوس کی۔ رات کا وہ پراسرار سرد ہوا کا جھونکا پھر ایک دفعہ مجھے قریب محسوس ہونے لگا۔ اور میں بید مجنوں کی طرح کانپنے لگی۔ اس کے بعد مجھے مطلق یاد نہیں رہا کہ کیا ہوا تھا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

عذرا باجی

"حمیدہ سلطانہ"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

مس حمیدہ سلطانہ

تعارف - آپ لفٹننٹ کرنل ذوالنور علی احمد صاحب اور محترمہ قیبہ سلطان بیگم (بنتِ نواب باقر علیخاں خلفِ اکبر نواب زین العابدین خاں عارف) کی دُختر نیک اختر ہیں۔ آپکا شمار ملک کی اُن مایہ ناز خواتین میں ہوتا ہے جنکا نام اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اُردو زبان تو خیر آپکے گھر کی لونڈی ہی ہے۔ آپ فارسی زبان کی بھی ایک متبحر عالم ہیں۔ فارسی کی تعلیم آپنے اپنے عالم و فاضل پدر بزرگوار سے حاصل کی۔ آپکی تاریخ پیدائش ۷۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء ہے۔ ادبی زندگی کی ابتدا ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں آپنے باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ اور آپکے علمی ادبی اور اصلاحی مضامین اور افسانوں نے ادبی محفلوں میں ایک حیرت زا اور خوشگوار ہلچل سی مچادی جس طرح بنگال کو سفنتا چیٹرجی کی ذات پر فخر ہے اسی طرح صوبہ دہلی کو آپ جیسی علمدوست اور مصلح خاتون پر ناز ہے سماج کی اصلاح کیطرف خاص طور پر آپکا رجحانِ طبیعت ہے۔ چنانچہ آپکی تحریریں وہی خدمت انجام دے رہی ہیں جو اس سے پہلے سفنتا چیٹرجی انجام دے چکی ہیں۔ ایک لحاظ سے آپ ان سے بڑھ کر ہیں وہ اس طرح کہ آپنے بھولی بھٹکی ہندوستانی خواتین کی اصلاح کا بیڑہ بھی اُٹھا رکھا ہے۔

محترمہ حمیدہ سلطانہ صاحبہ ایک عالم و فاضل خاتون ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ درجہ کی شاعرہ بھی ہیں لیکن آپنے بہت کم نظمیں لکھی ہیں۔ آپکی نظم "جمنا" اردو ادب میں ہمیشہ یادگار رہیگی۔ اسقدر کم عمری میں آپنے اردو ادب اور خواتین ہند کی جو خدمت انجام دی ہے شاید ہی کسی اور خاتون نے انجام دی ہو۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

آج صبح ہی صبح میں نے اپنے دریچے کو کھول دیا۔ دسمبر کی سرد ہواؤں کے ساتھ زرد زرد دھوپ کا ایک سیلاب بھی اندر آ گیا۔

مَیں نے انگڑائی لے کر اپنے سردی سے اکڑے ہوئے اعضا کو حرکت دی اور سامنے نظر ڈالی۔ نیلا آسمان آج کسی پاکباز کے دِل کی مانند صاف اور روشن ہے۔ سریلے پرند ابھی تک گا رہے ہیں۔ نارنگی کے پھولوں کی خوشبو دِل و دماغ کو فرحت پہنچا رہی ہے۔

اِس سہانے سمے میں مجھے آج سے چار سال قبل کا قیامِ بمبئی، اور عذرا باجی یاد آ رہے ہیں۔ یہ عذرا باجی کون تھیں؟ اور مجھے کیوں یاد آ رہی ہیں؟ یہ سب واقعات میں آج قلمبند کروں گی۔

ہندوستانی سوسائٹی کی ہولناکیوں کو منظرِ عام پر لانے کے لئے ایک سچی رُودادِ حیات مَیں لکھ رہی ہوں۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

میرے والد گورنمنٹ سروس میں تھے۔ اِس لِئے ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا، چونکہ تعلیمی ضرورت کے لئے میرا کسی ایک جگہ مستقل قیام کرنا ضروری تھا اِس لِئے مجھے میٹرک کرنے کے بعد بمبئی میں خالہ کے ہاں والدہ نے چھوڑ دیا اور میں مستقل طور پر پانچ سال بمبئی رہی۔

میرے خالو کا انتقال ہو چکا تھا۔ اِس لِئے خالہ جان نے اپنی وسیع دو منزلہ کوٹھی کا نچلا حصہ کرایہ پر ایک بیوہ خاتون کو دے دیا تھا اُس خاتون کی بیٹی نازلہ سے جو مجھ سے کچھ ہی بڑی تھی میری دوستی ہو گئی۔ اور ہم دونوں شیر و شکر ہو گئیں۔ لیکن ڈیڑھ سال بعد ہی نازلہ کی شادی ہو گئی اور وُہ اپنے شوہر کے ہاں سدھاری۔ بوڑھی خاتون بھی بیٹی کے پاس چلی گئی۔ اب اس گھر میں میرا کوئی ہمجولی نہ تھا۔ اِس لِئے میں اداس رہتی تھی۔ اَور دعا مانگتی تھی۔ کہ نچلی منزل میں کوئی ایسا کرایہ دار آئے جو میرا ہمجولی بن سکے۔ لیکن اس کو خالی ہوئے تین ماہ گزر گئے اَور کوئی معقول کرایہ دار نہ ملا۔ یہ زمانہ میرے لِئے بہت صبر آزما تھا۔ بمبئی جیسے شہر میں اور ایسی اچھی جگہ جہاں خالہ جان کا گھر تھا، تین روز بھی گھر کا خالی رہنا مشکل تھا۔ لیکن اتفاق کی بات ہے کہ کوئی موزوں کرایہ دار اتنے روز میں نہ مل سکا۔ جو لوگ آتے تھے۔ وُہ اس قسم کے تھے جن کو رکھنے سے زیادہ خالہ جان نچلی منزل کا خالی رہنا بہتر سمجھتی تھیں۔

ہلکی ہلکی گرمیاں تھیں۔ میں حسبِ معمول چائے کے بعد شام کو پائیں باغ میں گلاب کے پھولوں سے کھیل رہی تھی۔ کہ یکایک میرے کان میں کار کے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ٹھہرنے کی آواز آئی ۔ میں دروازے کی طرف بھاگی ۔ اور جب قریب پہنچی ۔ تو قیمتی پیکارڈ سے ایک بہت حسین ادا ، نوعمر خاتون ، سپید سادی ریشم کی ساڑھی میں ملفوف اُتر رہی تھیں ۔ نسیم بہار کے ہلکے جھونکوں کی طرح وُہ خراماں خراماں میرے قریب آئیں ۔ اُن کی شان و شوکت اور دلربا حُسن نے مجھے مبہوت کر دیا تھا ۔ اور میں ساکت کھڑی ٹکٹکی باندھے ان کو دیکھ رہی تھی کہ انہوں نے مسکراتے ہوئے دلکش لہجے میں کہا ۔ "عزیزہ بہن ! اِس گھر کے سامنے "ٹولیٹ" کی تختی دیکھ کر میں اِدھر آئی ہُوں ، کیا تکلیف گوارا فرما کر آپ مجھے نچلی منزل کے کمرے دِکھا سکیں گی ؟"

میں اب عالمِ محویت سے چونکی ۔ اور اپنی بے موقع خاموشی کی معافی مانگتے ہوئے نچلی منزل ان کو دکھا دی ۔ اور دِل میں دعا مانگتی رہی ۔ کہ خدا کرے یہ گھر ان کو پسند آ جائے ۔ چند منٹوں میں ان کی دِلربا موہنی صورت نے مجھے اپنا گرویدہ کر لیا تھا ۔ میری دعا مقبول ہوئی ———

"یہ جگہ بہت موزوں ہے ۔ ساری بمبئی چھان ماری جب کہیں یہ حسبِ دلخواہ گھر ملا ہے ۔ ہاں کرائے کے متعلق کِس سے گفتگو کرنی ہو گی ؟" ——— اُنہوں نے اپنے خوبصورت سر کو جنبش دے کر کہا ۔

مَیں نے جواب دیا ۔ "آپ چاہیں تو خالہ جان سے اس کے متعلق طے کر سکتی ہیں ۔ عام طور پر بڑے بھائی جان گفتگو کیا کرتے ہیں ۔ مگر وہ اس وقت باہر گئے ہوئے ہیں ۔"

وُہ بولیں ۔ "میں آپ کی خالہ جان سے ہی گفتگو کر لُوں گی ۔"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

میں ان کو خالہ جان کے پاس لے گئی۔ حسین خاتون نے نہایت ادب اور شائستگی سے خالہ جان کا مزاج پوچھا۔ اور پھر کرائے کی بابت دریافت کیا۔ اور اپنا قیمتی خوب صورت بیگ کھول کر تین ماہ کا پیشگی کرایہ خالہ جان کو دے دیا اور رخصت ہوئیں۔

دوسرے دن صبح ہی وہ ایک حبشن خادمہ اور بوڑھے ملازم کے ہمراہ آگئیں۔ ان کے ساتھ سامان بہت مختصر تھا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ بمبئی میں بالکل نو وارد ہیں ـــــ لیکن ایک ہفتے کے اندر ہی اندر تمام کمرے ان کے قیمتی سازوسامان سے عروسِ نو کی طرح سج گئے اور متعدد ملازم رکھ لئے گئے۔ ان کے رہائش کے انداز اور طور طریقے سے شاہانہ شان و شکوہ ٹپکی پڑتی تھی۔ طرز معاشرت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بڑے عالی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔

ان خاتون کا نام عذرا تھا۔ چونکہ ان کی عمر مشکل سے تئیس یا چوبیس سال کی ہوگی۔ اور مجھ سے کچھ زیادہ بڑی نہ تھیں۔ اسلئے میں ان سے جلد ہی بے تکلف ہوگئی۔ اور انہیں عذرا باجی کہنے لگی۔ شام کی چائے اکثر میں ان کے ساتھ پیتی تھی۔ اتفاق سے کالج سے آکر اگر میں ان کے ہاں جانے میں ذرا بھی دیر کرتی، تو ان کی حبشی خادمہ نرگس بلانے کے لئے آجاتی تھی۔

عذرا باجی کو مصوری کا بہت شوق تھا۔ اور افسانہ نگاری تو ان کا ہی حصہ تھا۔ ان کے لکھے ہوئے افسانے ہر ممتاز رسالے میں نظر آتے۔ ان کی لائبریری مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ تھی۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

عذرا آپا جی کو مطالعے سے عشق تھا۔ تمام دن یا تو وہ دریچے میں بیٹھی بہترین ادبی و علمی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتیں یا پھر افسانے لکھتیں اور کبھی کبھی کوئی تصویر بھی بنا لیتیں۔ لیکن حیرت یہ تھی کہ باوجود اس قدر تموّل اور نوعمری کے ان کی نہ کوئی سہیلی تھی نہ کوئی عزیز۔ نہ ان کے پاس کوئی آتا تھا۔ نہ وہ خود کسی کے پاس جاتی تھیں۔ بس ایک میں تھی جو ان کی تنہائیوں میں مخل ہوتی، اور مجھے وہ بہت ہی عزیز رکھتی تھیں۔ میری خود یہ حالت تھی کہ جب تک ان سے دور رہتی۔ ان کی موہنی صورت نظروں کے سامنے رہتی۔ اور کالج سے آتے ہی میز پر کتابیں پٹخ کر پھر میں ان کے پاس ہی جا کر دم لیتی تھی۔

عذرا آپا جی پردہ تو نہ کرتی تھیں لیکن ایک دفعہ بھی وہ باوجود اس قدر میل جول کے میرے خالہ زاد بھائیوں کے سامنے نہ آئیں۔ شام کے دھندلکے میں وہ کبھی کبھی میرے اصرار پر چوپاٹی چلی جاتی تھیں، لیکن وہاں کے دلکش مناظر کو دیکھ کر بجائے خوش ہونے کے وہ سرد آہیں بھرا کرتی تھیں اور کبھی کبھی تو ان کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو بھی آ جاتے تھے۔

میں نے بارہا ان کی اس افسردگی کا راز معلوم کرنا چاہا۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا۔ "ماں باپ کا سایہ بڑی نعمت ہے۔ اپنے والدین کی قدر کیا کرو نسیمہ پیاری! میرا کوئی بھی نہیں۔ میں کیسے خوش رہ سکتی ہوں۔"

بڑے بھائی جان کی شادی ہونے والی تھی۔ اور ہم سب نہایت سرگرمی سے شادی کے انتظامات میں منہمک تھے۔ عذرا آپا جی بھی برابر شادی کے اہتمام میں حصہ لیتی تھیں۔ خالہ جان نے دلہن کے جوڑے ان کی رائے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کے مطابق تیار کرائے۔ شادی کا دن آ پہنچا۔ صبح ہی سے ہم سب نے تیار ہونا شروع کر دیا۔ مَیں نے اپنی بہترین اور پسندیدہ ساڑھی پہن کر ہلکا ہلکا زیور پہنا۔ پھر ایک ناقدانہ نظر اپنے پر ڈالی۔ جب اپنے کو ہر اعتبار سے درست پایا۔ تو عذرا باجی کے پاس گئی۔ وہ ابھی تک شب خوابی کے نیلے ریشمی لباس میں بستر پر بیٹھی ہوئی رباعیاتِ عمر خیام دیکھ رہی تھیں۔ میں نے کہا

"واہ باجی آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔"

"آہا نسیمہ، آج تو تم سُرخ پری بن آئی ہو۔ ماشاء اللہ یہ ساڑھی اَور زیور تم پر بہت پھب رہا ہے۔ کہیں میری نظر تم کو نہ لگ جائے۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

" باجی مجھ نگوڑی کی صورت بھی کوئی صورت ہے۔ پہلی چھڑی ہونا بھی کوئی قابلِ تعریف بات ہے۔ صورت آپ کی ہے ماشاء اللہ، چندے آفتاب چندے ماہتاب!" میں نے ذرا الجھا کر جواب دیا۔

"شکریہ تمھاری تکلیف کا نسیمہ پیاری"۔ عذرا باجی نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

مَیں نے کہا۔" اُٹھیئے بھی باجی! آپ تو ابھی باتیں ہی کر رہی ہیں اَور وہاں سب چلنے کو تیار بیٹھے ہیں۔"

" گھبراتی کیوں ہو، میں ابھی تیار ہوئی"۔ باجی نے سپید ریشم کی ساڑھی جس کے کناروں پر گلاب کے پھول کڑھے ہوئے تھے الماری سے نکال کر جواب دیا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

" واہ باجی ! آج بھائی کی شادی کے روز بھی آپ سپید ساڑھی پہنیں گی" میں نے کہا

" لیکن میرے پاس تو رنگین ساڑھی ہے ہی نہیں۔ البتہ دو چار سیاہ ساڑھیاں ہیں۔ شادی کے موقع پر سیاہ ساڑھی پہننا بدشگونی ہے تم خود الماریوں میں دیکھ لو۔" باجی نے دلربایانہ انداز سے جواب دیا۔

میں نے الماریاں کھول کر ساڑھیوں کے بنڈل کے بنڈل نکال کر باہر ڈال دیئے۔ واقعی دونوں الماریوں میں سپید ساڑھیاں بھری پڑی تھیں یا سیاہ تھیں۔ میں نے مایوس ہو کر دوسری الماری کا نچلا خانہ کھولا تو خلافِ توقع حریری کاغذوں میں لپٹی ہوئی ایک رنگین چیز نظر آئی میں نے جلدی سے کاغذ ہٹا کر دیکھا۔ یہ ایک بہت خوبصورت قیمتی ارغوانی زرکار ساڑھی تھی۔ اس کے کناروں پر انگور کی بیل سنہرے مقیش سے بنی ہوئی تھی اس ساڑھی میں سے " ایوننگ اِن پیرس" کی خوشبو اس طرح نکل رہی تھی، گویا ابھی تہ کر کے رکھی گئی ہے۔

میں نے ساڑھی کو نکالا۔ تو اس کی تہ میں سے ایک بیش قیمت موتیوں کی مالا نکل کر میرے سامنے گری۔ میں یہ ساڑھی اور مالا دیکھ کر فرطِ مسرت سے بے خود ہو گئی۔ اور ساڑھی کو ہاتھ میں اٹھا کر ناچ کر بولی " دیکھیے باجی آخر میں نے آج کے پہننے کے لائق ساڑھی ڈھونڈھ ہی نکالی۔ یہ ساڑھی زیبِ تن کر کے اور مالا گلے میں ڈال کر آپ کیسی اچھی لگیں گی۔"

لیکن باجی کا رنگ اس حسین ساڑھی کو دیکھ کر متغیر ہو گیا۔ اور

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

وُہ چند منٹ کانپتے رہنے کے بعد نڈھال ہو کر گر پڑیں۔

نرگسؔ ان کے قریب ہی کھڑی تھی۔ اور باجی کو کانپتے اُس نے دیکھ لیا تھا۔ اُس نے ان کو سنبھال لیا۔ ورنہ نہ جانے فرش پر گرتیں تو کس قدر چوٹ لگتی۔ میری ساری خوشی باجی کی یہ حالت دیکھ کر رفوچکر ہو گئی تھی۔ اور میں اپنی حرکت پر نادم تھی۔ ساڑھی کو خانے میں ڈال کر میں نے الماری بند کی۔ اور باجی کی تیمار داری کرنے لگی۔

کچھ دیر بعد باجی کو ہوش آ گیا۔ لیکن وہ اس وقت بہت کمزور معلوم ہو رہی تھیں۔ ہوش آتے ہی انہوں نے نحیف آواز میں کہا۔ "میں اب جانے کے قابل نہیں، خالہ جان سے معافی مانگ لینا۔ تم جاؤ نسیمہ! شام کو میں دلہن کا استقبال کر لوں گی"۔

اتنی دیر میں ان کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے کوئی برسوں کا بیمار ہو۔ میرا اِس وقت ان کو چھوڑ کر جانے کو دِل نہ چاہتا تھا۔ مگر خالہ جان برابر بلا رہی تھیں۔ بارات دلہن کے گھر جانے کو تیار تھی۔ میں مجبور ہو کر چلی آئی لیکن میرا خیال باجی عذرا میں ہی پڑا رہا۔

جب ہم لوگ دلہن کو لے کر واپس آئے۔ تو باجی وہی صبح والی سپید ساڑھی پہنے ہوئے دلہن کی پیشوائی کے لِئے دروازے پر کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ اور اس وقت وُہ جنت کی ایک حور معلوم ہو رہی تھیں۔

اب وُہ بشاش و خوش تھیں۔ لیکن میں سمجھ گئی کہ اِس افسردگی اور خلوت نشینی میں کوئی گہرا راز ہے۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

دلہن کو باجی نے بہت قیمتی جڑاؤ ہار دیا۔ اور عزیزوں کی طرح سب رسوم شادی میں شرکت کرتی رہیں۔

ایک روز شب کو کالج میں پارٹی ہونے کے باعث میں ذرا دیر سے آئی تو خالہ جان نے کہا۔ کہ "تم کو دو بار نرگس بُلانے آئی تھی۔ عذرا خاتون کو بخار ہے"!

باجی کو بخار ہے یہ سن کر مجھ کو بھلا کہاں چین آ سکتا تھا۔ تھکی ہوئی تھی لیکن ساڑھی اتار کر لباسِ شب خوابی پہنا۔ اور آسمانی ریشم کی چادر کاندھوں پر ڈال کر پچھلی منزل کا رخ کیا۔ دبے پاؤں باجی عذرا کی خوابگاہ میں گئی تاکہ ان کے آرام میں مخل نہ ہوں۔ باجی ملائم سفید تکیوں کے درمیان نیم دراز تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی جس کو سبز برقی روشنی میں وہ دیکھنے میں محو تھیں۔ میں قریب جا پہنچی لیکن باجی کو خبر نہ ہوئی۔

میں نے دیکھ لیا۔ یہ تصویر ایک بہت شکیل و جمیل جوان رعنا کی تھی! اِس تصویر کا منظر بالکل شاعرانہ تھا۔ خوش نما باغ میں پھولوں کے کنج میں یہ نوجوان شام کے لباس میں محوِ کتب بیٹھا تھا۔

مَیں نے باجی کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وُہ چونکیں، اِس طرح جیسے کوئی خواب سے جاگا ہو۔ اور خواب آلود آواز میں بولیں۔ "تم کب آئیں نسیمہ؟"

"ابھی باجی"! میں نے آہستہ کہا

"اِس تصویر کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے نسیمہ؟" باجی نے اُداس لہجے میں سوال کیا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

یہ تصویر آپ کے کسی عزیز کی ہوگی باجی!" میں نے ان کی اس وقت
کی غمگینی سے متاثر ہو کر جواب دیا۔
ہاں یہ صحیح ہے۔ یہ میرے ایک ایسے عزیز کی تصویر ہے جس کی طرح دنیا
میں مجھے کوئی عزیز نہیں ہے۔ آہ یہ اُس ناشاد نوجوان کی تصویر ہے۔ جس کو
عین عالمِ شباب میں میرے سرپرستوں نے زندگی کی خوشیوں سے محروم کر دیا
ہاں یہ اُس مظلوم انسان کی تصویر ہے جو دُور فضا پر ٹکٹکی لگائے نہ جانے کیا
کیا سوچا کرتا تھا ـــــ جس کا شباب ایک پھولوں بھرا گلشن تھا۔
لیکن نامرادی کی زہریلی ہوا نے اِس گلشن کو آنِ واحد میں پژمردہ کر دیا
نسیمہ! تم نے کئی مرتبہ میری افسردگی کا راز معلوم کرنا چاہا۔ لیکن میں
نے ہر دفعہ ٹال دیا۔ اب میں تم کو بتاؤں گی ـــــ ہر بات کا ایک وقت
ہوتا ہے۔ دنوں میں نے اپنے جذبات سے سرگوشیاں کی ہیں۔ اب
میں گھبرا گئی ہوں۔ انسان کو ایسے وقت میں ایک رازدان ہمدرد کی ضرورت
ہوتی ہے۔ جب وہ گھبرا جائے اور اکتا جائے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔
کہ تھوڑے دنوں بعد مجھے ابدی سکون حاصل ہو جائے گا۔ اور میری اس
افسردہ زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ .... میں کس طرح رسم و رواج کی
قربان گاہ پر چڑھا دی گئی اور کس طرح میری زندگی ہندوستانی سوسائٹی
کی خودغرضی کا شکار ہو گئی۔ یہ داستان میں تم کو سناؤں گی۔ لیکن اب
نہیں صبح، یہ تو میرا افسانہ زندگی ہے۔ اتنی تھوڑی دیر میں کیسے سنا دوں۔"
یہ سب کچھ باجی عذرا ایک سانس میں کہہ گئیں اور پھر اُنکی حسین

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بندھ گیئں۔ جن کو بار بار وُہ اپنے معطر رومال
میں جذب کر رہی تھیں۔ مَیں نے باجی کو پہلے کبھی اِس طرح روتے نہ دیکھا تھا
میں گھبرا گئی اور ان کو بڑے اصرار سے عرقِ گلاب کے دو تین گھونٹ پلائے
جب ان کا دِل ذرا ٹھہرا تو میں اپنی خوابگاہ میں واپس آئی۔ لیکن ساری
رات نیند نہ آئی۔ باجی کی حسین اور غمزدہ صورت نظروں کے سامنے رہی
ان کے الفاظ کانوں میں گونجتے رہے۔ اور تمام شب کروٹیں بدلکر گزار دی۔

صبح اٹھتے ہی حسبِ معمول میں نے غسل کیا۔ اور خالہ جان سے یہ
کہکر کہ آج میں کالج نہ جاؤنگی طبیعت مکدّر ہے، سیدھے باجی کے پاس چلی گئی۔
یہ موسم بہار کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ آسمان پر اُودے اودے برساتی
بادل چھا رہے تھے۔ سامنے شاہ بلوط کے درخت پر شاما گا رہی تھی۔
اس کی آواز میں ایک درد تھا جو دِل پر اثر کرتا تھا۔ باجی کی خوابگاہ کی شمالی
کھڑکی کے سامنے جُوہی کی بیل چھائی ہوئی تھی۔ اُس کے پھولوں کی خوشبو
سے تمام کمرہ معطر ہو رہا تھا۔ وہ حسبِ عادت اِس وقت مسکرا رہی تھیں
اب ان کے حسین چہرے پر رات کی مانند غم کی کوئی علامت نہ تھی، البتہ
ان کی حسین خمار آلود آنکھوں کے سُرخ ڈورے بتلا رہے تھے۔ کہ وہ
بھی رات بھر جاگتی رہی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے شیریں لہجے میں کہا۔
"صبح بخیر نسیمہ پیاری!"

میں نے ان کا خوبصورت صندلی ہاتھ ادب سے چوما اور مزاج پرسی
کی، اتنے میں نرگس چائے لیے آئی اور عذرا باجی معمول کے مطابق تواضع

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کرنے لگی۔ "یہ انناس کا مربہ تو نسیمہ ——— اور ہاں یہ انگور! ——— یہ سیب تو تمہیں ضرور لینے ہوں گے، یہ پارسل کل ہی کشمیر سے آیا ہے۔"

میں نے اُکتا کر کہا۔ "باجی! یہ تکلفات رہنے دیجئے۔ میں سب کچھ لے لوں گی۔"

چائے ختم ہوئی۔ نرگس برتن اٹھا کر لے گئی۔ اب مجھے اشتیاق تھا۔ کہ باجی وُہ داستان سنائیں۔ جس کے باعث وُہ اِس قدر رنجیدہ ہیں۔ لیکن باجی بالکل خاموش بیٹھی خدا جانے کیا سوچ رہی تھیں۔ ان کو گم سُم بیٹھے بیٹھے آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ میں ان کی اِس طویل خاموشی سے اُکتا سی گئی۔ لیکن بولنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔

آخر انہوں نے خود ہی یہ طلسمِ سکوت توڑا اور بولیں۔ "ہاں، تو تم میری داستانِ حیات سننے کے لئے تیار ہو، یہ داستانِ حیات ایک افسانۂ خونچکاں ہے تمناؤں اور آرزؤں کا۔ تم گھبرا تو نہ جاؤ گی نسیمہ؟"

"باجی میں تو سننے کے لئے بے قرار ہوں۔ آپ فرمایئے۔" میں نے مستعدانہ لہجے میں جواب دیا۔

باجی نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور دلربا انداز سے ایک انگڑائی لے کر کہنے لگیں:۔

"میرے دادا شہزادہ سلیمان جاہ بہادر سلطان ٹیپو کے سگے بھانجے تھے۔ جس وقت انگریزوں سے سلطان ٹیپو کی لڑائی ہوئی۔ تو جتنے جوان مرد تھے سلطان کے جھنڈے تلے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ لیکن

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

دادا جان اس وقت پورے چھ سال کے بھی نہ تھے۔ ان کے والد بھی شہید ہو گئے۔ اور والدہ بھائی اور شوہر کے غم میں گھل گھل کر تھوڑے عرصے بعد فوت ہو گئیں۔ اور دادا جان کو ایک وفادار بوڑھے داروغہ نے پالا اور اسکی کوششوں سے دادا جان کا الاؤنس بارہ ہزار روپیہ ماہوار کمپنی نے مقرر کر دیا۔ دادا جان کو اس بوڑھے نمکخوار کے باعث کچھ بھی تکلیف نہ اٹھانی پڑی۔ اور ان کی زندگی عیش و آرام سے گزری۔ دادی جان مرحومہ ایک والیٔ ریاست کی اکلوتی صاحبزادی تھیں اسلئے بہت سا جہیز، نوکر چاکر اور جاہ و حشم میکے سے لائی تھیں۔ اپنے وسیع محل میں دادا جان شاہانہ شان و شکوہ سے زندگی بسر کرتے رہے۔ دادا جان کی صرف تین اولادیں تھیں۔ بڑے چچا پرنس اعظم جاہ اور میرے والد پرنس مکرم جاہ بہادر اور ان دونوں بھائیوں سے چھوٹی بہن زہرا پھوپھی تھیں۔

دادا جان کا انتقال میری پیدائش سے قبل ہو چکا تھا۔ بڑے چچا بھی عین عالم شباب میں صرف ایک لڑکا سکندر جاہ چھوڑ کر وفات پا گئے تھے۔ میرے والد کے اولاد نرینہ نہ تھی۔ دو لڑکیاں ہی تھیں ایک میں اور مجھ سے بڑی بہن آپا ناہید۔

زہرہ پھوپھی بہت حسین و مہوش نازک اندام خاتون تھیں لیکن اپنے حسن و جمال پر ان کو بہت غرور تھا۔ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھیں دادی جان نے زہرہ پھوپھی کی شادی حیدر آباد میں ایک بڑے امیر کبیر اور جلیل القدر جاگیردار نواب مہدی یار جنگ سے کر دی تھی۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

نواب صاحب کی پہلی بیوی اور بچے موجود تھے۔ زہرہ پھوپھی سے شادی صرف اُن کے حُسن کا شہرہ سُن کر کی تھی۔ بڑے چاؤ چونچلوں سے لاکھوں روپیہ صرف کر کے وُہ اِن کو بیاہ لے گئے۔ مگر زہرا پھوپھی جیسی نازک مزاج بھلا چالیس سالہ لحیم وشحیم کمزور انسان کو کب خاطر میں لانے والی تھیں۔ وُہ نگھی کا ناچ نچایا کہ نواب صاحب کو بھی چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔

نواب کے یہاں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ روپے کی ریل پیل اور پھر چہیتی بیوی۔ نواب پھوپھا ہیترا بیوی کا دل ہاتھ میں لینا چاہتے۔ نت نئے زیورات اور انواع و اقسام کے لباس لا کر دیتے۔ آرام و آسائش کے نئے نئے سامان مہیا کرتے۔ روزانہ کھیل تماشے اور رقص و سرود کے جلسے کراتے۔ لیکن بیگم صاحبہ کی تیوری کا بل نہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ اللہ کی بندی کو کسی سے سیدھے منہ بات کرنا قسم تھی۔ دادی جان نے انباروں جہیز اپنی لاڈلی کو دیا۔ اور نوکروں کی ایک پوری فوج ساتھ کی۔ مگر اس سے نواب صاحب کی صورت کی کمی پوری نہ ہو سکتی تھی۔ شادی کے ایک سال بعد ہی زہرہ پھوپھی میکے آن بیٹھیں۔ اور اعلان کر دیا کہ چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے پر یہ بندی اب اس مُوئے لنگور کی صورت نہ دیکھے گی۔ کون تھا جو ان کے خلاف آواز نکالتا۔ سب نے سُنا اور ساکت رہ گئے۔

کچھ دنوں تک نواب صاحب نے کوشش کی کہ چہیتی بیوی کو منا کر لے جائیں۔ وُہ ان کی حسین صورت کے عاشق زار تھے۔ مگر پھوپھی نے ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں کہ اِن دم دلاسوں میں آ کر چلی جاتیں۔ ان کی بات

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

تو پتھر کی لکیر تھی۔ آخر ہار کر نواب صاحب بیٹھ گئے۔ اور اب ان کا نوابی جاہ و جلال بھی پوری شان سے جلوہ گر ہوا۔ پہلے زہرہ پھوپھی کے لڑکے جعفر کو جو میکے آنے کے چھ ماہ بعد تولد ہوا تھا خطاب نوابی اور تعلقے سے بالکل محروم کر کے دوسری بیگم کے بڑے لڑکے کو سب کچھ لکھ دیا۔ زہرہ پھوپھی سے شادی کرتے وقت انہوں نے تحریری معاہدہ کیا تھا کہ ان کے بطن سے جو لڑکا ہوگا۔ اس کو اپنا جانشین بنائیں گے۔ لیکن اب صورت حالات بدل چکی تھی اور مخالفت کی ہوا چل رہی تھی جعفر کو ایک ہزار روپے ماہوار کی رقم کے علاوہ موجودہ صورت میں باپ کے ہاں سے ایک پائی بھی زاید نہ مل سکتی تھی

اب تو زہرا پھوپھی کی آنکھیں کھلیں۔ بیٹے کی وہ شیدا تھیں حالانکہ بیٹا بالکل باپ کی شکل تھا۔ لیکن ماں کی مامتا خوبصورتی و بدصورتی کو کب دیکھتی ہے۔ میاں سے ملاپ کی بہت کوشش کی اور چاہا کہ کسی طرح مصالحت کی کوئی صورت ہو جائے تو جعفر کے لئے نواب صاحب اپنا خیال تبدیل کر دیں۔ لیکن نواب صاحب ان کی بدزبانیوں کے اب اس قدر شاکی تھے۔ کہ وہ کسی طرح اب جعفر کو اپنا جانشین بنانا نہ چاہتے تھے۔ زہرا پھوپھی اب اپنی تند مزاجی اور سخت گیری پر بہت پشیمان تھیں۔ لیکن اب پچھتانے سے کیا ہوتا تھا؟ اس ناکامی اور رنج نے ان کا مزاج اور بھی چڑچڑا کر دیا گھر کے تمام لوگ ان کے غصے سے خائف رہتے تھے۔ میں بھی جو سب سے چھوٹی اور سب کی لاڈلی تھی۔ ان کی بدمزاجیوں کا اکثر اپنی طفلانہ شرارت

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کے باعث نشانہ بنی رہتی تھی، آپا ناہید مجھ سے پانچ سال بڑی تھیں، اسلئے وُہ خلوص و یگانگت جو دو سگی بہنوں میں ہوتی چاہیئے۔ اِس عمر کے تفاوت کے باعث ہم میں نہ تھی۔ میرا سارا وقت نجمی کے ساتھ کھیل کر گزرتا۔ نجمی میرے ماموں کا لڑکا اور مجھ سے صرف ڈیڑھ سال بڑا تھا۔ ابھی وُہ پورے چار سال کا بھی نہ تھا کہ ماں کا انتقال ہو گیا۔ ممانی جان مرحومہ نہ صرف والدہ کی چہیتی بھاوج بلکہ پیاری سہیلی بھی تھیں۔ ماموں جان نے ان کے انتقال کے چند ماہ بعد ہی ایک پارسن سے شادی کر لی تھی اور بچارہ نجمی سوتیلی ماں کے مظالم کا شکار ہو رہا تھا۔ اِس لئے والدہ اُس کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ والدہ نجمی کو بیٹوں کی طرح چاہتی تھیں کہتی تھیں میرے بیٹا نہیں ہے۔ خدا نے مجھے یہ بیٹا دے دیا ہے۔ اور میری خوشی کی تو کوئی انتہا نہ تھی۔ ایک ہم عمر ساتھی کھیلنے کو مل گیا تھا —— آہ وُہ ایام بے فکری کہ تمام تمام دن ہم معصومانہ کھیلوں میں منہمک رہ کر گزار دیتے۔

میری نویں سالگرہ ہوئے کچھ ہی روز ہوئے تھے۔ کہ والدہ کو موتی جھرا ہوا اور باوجود بہت احتیاط و تیمارداری کے وُہ اُس موذی مرض سے جانبر نہ ہو سکیں۔ غریب نجمی ازلی بدنصیب تھا۔ اسکی یہ چاہنے والی بھی نہ رہی۔ مجھے اِتنی سمجھ نہ تھی کہ زیادہ احساس ہوتا۔ پھر بھی سمجھ کے مطابق میں اور نجمی نے کافی دنوں تک رنج کیا۔ لیکن لڑکپن کی والہانہ خوشیوں میں کھو کر کچھ عرصے کے بعد ہم اُس غم کو بھول گئے۔ جو ہماری آئندہ بربادی کا پیش خیمہ تھا۔ نجمی بہت حسین و جمیل اور بلا کا ذہین لڑکا تھا۔ چھوٹی سی

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

چھوٹی سی عمر میں ایسی تصویریں بناتا کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے تھے۔ ابا جان گجّی کی ذہانت کے دل سے قدردان تھے اور اب وہ گھر والوں کی آنکھوں کا بھی تارا تھا۔ ایک نہ جانے زہرا پھوپھی کیوں اس سے جلتی تھیں جہاں کہیں انہوں نے مجھ کو اور گجّی کو کھیلتے دیکھا۔ فوراً برہم ہوگئیں۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہم ان کو بکتا جھکتا چھوڑ کر ہنستے ہوئے بھاگ جاتے۔

آہ لڑکپن بھی کتنا دلچسپ ہوتا ہے۔ کسی بات کا احساس نہ فکر۔ والد والدہ کو بہت چاہتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد وہ ہر وقت مغموم رہتے۔ اُن کی صحت بھی خراب ہوگئی تھی۔ دل ان کا ہمیشہ سے کمزور تھا۔ مگر اب دل کی تکلیف ان کو اکثر ہو جاتی تھی اور اپنی زندگی سے وہ مطمئن نہ تھے۔ اسلئے والدہ کی وفات سے دو سال بعد ہی انہوں نے ناہید آپا کی شادی رچا دی۔ حالانکہ ابھی وہ پورے سولہ سال کی بھی نہ تھیں ایسی شادیاں ہندوستان میں بہت کم ہوتی ہیں جیسی ہماری آپا کی ہوئی۔ ناہید آپا حور منظر تھیں، تو بھائی سکندر ملکوتی حسن کے مالک۔ دونوں لڑکپن کے ساتھ کھیلے اور ایک دوسرے کو دیوانہ وار چاہتے تھے۔ فرق بھی کچھ زیادہ نہ تھا۔ سکندر بھائی آپا سے دو یا سوا دو سال بڑے تھے اور بڑا ہی موزوں جوڑ تھا۔

آپا کی شادی کے زمانے میں ہوش سنبھالنے کے بعد جس قدر میں خوش رہی۔ پھر ایسی خوشی کبھی میسر نہ آسکی۔ شادی بہت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی۔ سارا خاندان دو ماہ تک خوشیوں میں مگن رہا۔ ناہید آپا لباسِ عروسی میں کتنی پیاری معلوم ہو رہی تھیں یہ چیز لفظوں میں نہیں سما سکتی۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ناہید آپا کی شادی کے بعد زہرا پھوپھی نے میرے لئے تمہید اٹھائی۔ لیعنی مجھ کو اپنے لاڈلے بیٹے جعفر کے لئے مانگا۔

والد نے کہا۔ "میں لڑکپن کی منگنی کا قائل نہیں"۔

"لیکن سکندر اور ناہید بھی تو لڑکپن سے ہی منسوب تھے"۔ زہرا پھوپھی نے جواب دیا

"اماں حضرت کے حکم اور بھائی جان کی وصیت کیوجہ سے میں مجبور ہو گیا"۔ والد نے کہا

"یہ میری خوشی ہے، میں بھی آپ کی بہن ہوں۔ کیا آپ کی اولاد پر مجھ کو حق نہیں ہے؟" زہرہ پھوپھی نے جلدی سے کہا۔

"میری اولاد پر تم کو بیشک حق ہے۔ لیکن مزاجوں کو بھی تو دیکھا جاتا ہے۔ جعفر اور عذرا میں ایک منٹ نہیں بنتی۔ ناہید و سکندر لڑکپن ہی سے شیر و شکر تھے۔ پھر میں کیسے اقرار کر لوں"۔ والد نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

"ابھی بچے ہیں۔ بڑے ہونگے سمجھ آئیگی تو درست ہو جائیں گے۔ منگنی ہو جائے گی تو دونوں کو خیال ہو جائیگا"۔ زہرا پھوپھی نے کہا۔

"میں نا رضامندی کی شادیوں کے خلاف ہوں" والد نے مسکرا کر جواب دیا

"اوہو تو اب پسند کی شادیاں ہونگی؟" زہرہ پھوپھی تنگ آ کر بولیں

"تمہاری شادی پسند کے مطابق نہ ہوئی تو تم کیا پھلی پھولیں جو اعتراض کرتی ہو زہرا؟" والد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

زہرا پھوپھی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔

اتفاق سے میں یہ ساری گفتگو سن رہی تھی۔ کیونکہ والد اپنے دار المطالعہ میں تھے۔ اور میں گیلری میں۔ گو مجھے پوری سمجھ نہ تھی لیکن

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

نہ جانے کیوں مجھے والد کے اِس انکار سے مسرت ہوئی۔ اور اب میں بھمی کے ساتھ کھیلنے سے پھوپھی کے برہم ہو جانے کا راز سمجھ گئی۔

زہرا پھوپھی بھلا کب نچلی بیٹھنے والی تھیں، ایک ایک کی دس دس دادی جان سے جا کر لگائیں۔ اور دوسرے دِن صبح جب ہم سب چائے کے لِئے جمع ہوئے تو دادی جان کی خاص خادمہ بیلا نے کہا۔ چھوٹے حضور آپ کو حضور عالیہ یاد فرماتی ہیں۔"

"اماں حضرت نے مجھ کو کہاں یاد فرمایا ہے بیلا؟" والد نے مصری سگار کا کش لیکر پوچھا۔

"اپنی عبادت گاہ میں۔" بیلا نے دھیمے مؤدّب لہجے میں جواب دیا اور ادب سے سر کو خم کئے اُلٹے قدموں واپس چلی گئی۔

والد اس طلبی سے کچھ متفکر ہو گئے اور چائے ختم کر کے کچھ دیر سگار کے کش لے کر دھوئیں کے چھلے بناتے رہے۔ اور پھر آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے دادی جان کی عبادتگاہ کی جانب چلے۔

میں سمجھ گئی کہ زہرا پھوپھی نے کوئی گُل کھلایا ہے۔ باتیں سننے کے لِئے میں بھی دادی جان کی عبادتگاہ کی کھڑکی کے قریب چھپ کر بیٹھ گئی۔

عود اور صندل کی خوشبو کھڑکی سے باہر آ رہی تھی۔ اور دادی جان اب صبح کی نماز کے بعد اپنی عبادت کی چوکی پہ بیٹھی وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔

"آداب عرض اماں حضرت!" والد کی آواز مجھے سنائی دی۔

"جیو، اقبال بلند ہو!" دادی جان کی آواز آئی۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"کس لئے آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے ؟" والد نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

"بیٹھو مکرم ! تم سے مجھے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" دادی جان پیار کی آواز سے بولیں۔

" فرمائیے میں ہمہ تن گوش ہوں۔" والد نے جواب دیا

" زہرا نے مجھ سے کہا ہے کہ تم عذرا کو جعفر سے منسوب کرنے میں انکار کرتے ہو۔ حالانکہ یہ میری دلی تمنا ہے، کیا یہ صحیح ہے مکرم ؟"

" نہیں ، مَیں نے تو انکار نہیں کیا۔ اماں جان آپ بھی بیوقوف زہرا کی باتوں میں آگئیں۔ صرف یہ کہا تھا کہ ابھی جلدی کیا ہے۔ عذرا ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اِس پر وُہ بگڑ گئی۔ مَیں نے مذاق سے ایک دو باتیں اس کے چھیڑنے کو اَور کہہ دیں۔ اُس کی اُس نے آپ سے شکایت کی ہوگی۔" والد نے تبسم آفرین لہجے میں جواب دیا۔

" ہاں بیٹا وُہ تو ایسی ہی بد مزاج ہے۔ اگر ایسی نہ ہوتی۔ تو اپنا گھر کیوں بگاڑتی۔" دادی اماں نے افسوسناک لہجے میں کہا۔

پھر والد کے قدموں کی آواز آئی اور وُہ چلے گئے۔ لیکن اس کے بعد کئی روز وہ زیادہ متفکر رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اِس ذکر نے ان کو کافی پریشان کر دیا ہے جعفر کو وُہ خود بھی پسند نہ کرتے تھے۔ بدصورت ہونے کے علاوہ بیجا لاڈ کی بدولت وہ چھچھورا، خودغرض اَور خوشامد پسند بھی تھا۔

آہ میرے گلشنِ حیات میں پھر ایک بار صرصرِ غم چلی۔ ابھی میں پورے چودہ سال کی بھی نہ تھی۔ کہ والد اچانک دِل کی حرکت بند ہو جانے کے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

باعث انتقال کر گئے۔ دادی جان بے چاری پہلے ہی ایک بیٹے کے غم میں نیم جان ہو گئی تھیں۔ اس سانحہ جانکاہ نے ان کو بالکل ختم کر دیا۔ اور والد کے انتقال کے چند ماہ بعد وہ بھی چل بسیں۔ کمسنی میں پے در پے صدمات نے مجھے عمر سے زیادہ سنجیدہ کر دیا۔ اور میں بجائے بےفکری اور کھیل کود کے غور و فکر کی عادی ہو گئی۔ اگر چچی اس زمانے میں میرا رفیق و غمگسار نہ ہوتا۔ تو میں یقیناً ان متواتر صدموں سے دیوانی ہو جاتی۔

دادی جان کے انتقال کے بعد محل کے تمام کاروبار اور انتظامات بڑی چچی کے ہاتھوں میں آ گئے۔ یہ ایک نیکدل اور سادہ مزاج خاتون تھیں۔ زہرا پھوپھی نے دادی جان کی زندگی میں کبھی بڑی بھاوج کا ادب نہیں کیا اور ہمیشہ اُن کی توہین کرتی رہیں۔ لیکن اب وہ چچی کی نہایت چاہنے والی —— اور دلسوز بن بیٹھیں۔ بچاری چچی بہت سیدھی سادی تھیں۔ زہرا پھوپھی کی بناوٹ کو اصلیت سمجھ کر ان کے مہربان ہونے سے بہت خوش تھیں، ہر کام ان کے مشورے سے کرتی تھیں۔ اس طرح چچی کے پردے میں گویا پھوپھی زہرا اب سارے گھر کی مالک تھیں۔ چچی جان مجھے اور ناہید آپا کو بہت ہی عزیز رکھتی تھیں۔ ناہید آپا تو خیر ان کی بہو تھیں۔ لیکن میرا بھی ان کو بہت خیال تھا۔ اور چچی تو ان کے ساتھ اس طرح لاڈ کرتا تھا۔ جیسے ان کا ہی بیٹا ہے۔ —— آہ چچی کا وہ پرخلوص چہرہ اب بھی میری نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔

شاہی خاندان کے رواج کے مطابق مجھے اور ناہید آپا کو سکول

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

میں داخل تو نہیں کیا گیا۔ لیکن ایک یورپین گورنس اوائلِ عمر ہی سے ہم پر تعینات کر دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ایرانی استاد ہمیں فارسی پڑھانے کیلئے رکھے گئے۔ اُردو اور دینیات کی تعلیم، کشیدہ کاری، سوزن کاری سکھانا ایک اور معمّر خاتون کے زیر اہتمام تھا۔ قرآن پاک خود دادی جان نے ہم کو پڑھایا تھا۔ آپا ناہید کو پڑھنے کا زیادہ شوق نہ تھا۔ کئی سال تک پڑھتے رہنے کے بعد ان کو اُردو فارسی میں لکھنے پڑھنے کی استعداد ہو گئی۔ انگلش بھی کارروائی کے مطابق آ گئی۔ لیکن کوئی خاص ترقی انہوں نے نہ کی۔ ان کا رجحان خانگی کاموں کی طرف زیادہ تھا۔ پڑھائی کے گھنٹوں میں بھی وہ سلائی اور کشیدہ کاری میں لگی رہتیں۔ یا باغ میں پھولوں کے متعلق مالیوں کو ہدایات دیتی رہتی تھیں۔ لیکن میں فطری طور پر یہ ذوق رکھتی تھی۔ اس لئے جلد ہی مجھے فارسی اور انگلش دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہو گیا۔ اور اُردو تو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مجھے اس قدر آ چکی تھی کہ میں بلا تکلف خط و کتابت کر سکتی تھی۔ پورے سترہ سال کی بھی نہ تھی جب میں نے ایک فارسی کی چھوٹی سی کہانی کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس کہانی کو دیکھ کر والد بے انتہا خوش ہوئے اور اُنہوں نے کہا۔ "ابھی تک مجھ کو کبھی کبھی یہ خیال آتا تھا کہ کاش میرے ایک لڑکا بھی ہوتا لیکن عذرا آج تمہاری یہ کہانی دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ خدا نے اگر تمہیں عمر دی تو تم میرے نام کو بیٹوں کی طرح چار چاند لگا دو گی۔"

آہ، وہ زمانہ ایک دلکش رنگین خواب تھا جو جلدی سے ختم ہو گیا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

آمدِ شباب نے ساری مسرتوں پر سایہ ڈال دیا۔ دادی جان کی زندگی تک میں ایک الھڑ لڑکی تھی جو ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی تھیں۔ لیکن ان کے بعد کچھ تو پے در پے صدمات سے میں خود ہی افسردہ تھی اور کچھ پھوپھی زہرا کی جا و بیجا خفگیوں نے مضمحل کر دیا۔

نجمی اور میں پہلے کی طرح ہر وقت ساتھ نہ رہ سکتے تھے۔ کیونکہ ہم دونوں اب بچے نہ تھے۔ ہماری یکجائی مشکوک نظروں سے دیکھی جاتی تھی۔ سوائے کھانے، ٹینس اور بیڈ منٹن کے اوقات کے۔ وہ صبح کی گل چینی دلآویز شاموں کی نغمہ سرائی اور شبِ ماہ کی آنکھ مچولی سب ختم ہو چکی تھی۔ اب تو ایک دوسرے کی طرف نظر بھی بہت ڈر ڈر کر اٹھاتے تھے اور معمولی بات چیت کرنا بھی مشکل سے نصیب ہوتا تھا۔ ہر وقت اعتراض کا خوف لگا رہتا تھا۔

ایک گرم شام کو میں موجودہ زندگی کی تلخی سے بہت افسردہ اور گھبرائی ہوئی سی تھی۔ اسلئے معمول کے مطابق ٹینس کھیلنے بھی نہ گئی۔ اور اپنے کمرے میں بیٹھی کروشیا سے بیل بناتی رہی۔ بظاہر میں بیل بنانے میں منہمک تھی لیکن درحقیقت میرے خیالات اس وقت نہ جانے کہاں تھے۔ اور میں فکروں کے اتھاہ سمندر میں غوطے لگا رہی تھی۔ مجھے اپنے انہماک میں وقت کے گزرنے کا بھی احساس نہ ہوا۔ یکایک میرے کانوں میں نجمی کی شیریں آواز آئی:۔

"میں اندر آ سکتا ہوں عذرا؟"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"ہاں"! بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔
اور نجمی کا شاداب مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔
"کیا کر رہی ہو؟" نجمی نے سوالیہ انداز میں کہا۔
"یونہی ذرا بیل بنا رہی ہوں۔" مَیں نے جلدی سے جواب دیا۔
"اور اندھیرے میں؟" نجمی نے ہلکا قہقہہ لگا کر کہا۔
"اچھا اندھیرا ہو گیا؟" مَیں برقی لیمپ کا بٹن دباتے ہوئے بولی۔
"خوب، تم کو معلوم ہی نہیں، میرا خیال ہے تم بجائے بیل بنانے کے کچھ سوچ رہی تھیں۔ ہے نا عذرا؟" نجمی نے سر کو جنبش دیکر سوال کیا۔
"میں تو کچھ بھی نہیں سوچ رہی۔ ویسے ہی ذرا دل اس وقت افسردہ ہو رہا ہے۔" مَیں نے جواب دیا۔
"نہیں عذرا، میں دیکھتا ہوں تم ہر وقت گہرے فکروں میں کھوئی رہتی ہو، بتاؤ تو کیا بات ہے؟" نجمی نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔
"میں کہہ تو رہی ہوں کہ کوئی بات نہیں۔ بس والد کی یاد مجھ کو اکثر ستاتی ہے۔ آہ، ان کی موت کا غم کیسے بھول جاؤں۔ میں بھی کتنی بدنصیب ہوں ماں ہے نہ باپ۔" میں نے سرد آہ بھر کر جواب دیا۔
"اس ہر وقت کی سوچ کا اثر تمہاری طبیعت پر بہت بُرا ہو گا۔ اگر ٹینس کھیلنے کے لئے آجاتیں۔ تو کچھ دل بہل جاتا۔" نجمی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔
"روز تو کھیلتی ہوں، آج دل نہ چاہا۔ بہت روز ہوئے تمہارا گانا نہیں سنا۔ آج کچھ سناؤ گے؟" میں نے سوال کیا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ میں تو ہر وقت نغمۂ دل تم کو سنانے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ تم سننا چاہو"۔ بجمی نے مسکرا کر شوخ لہجہ میں جواب دیا۔

"پھر تم نے شرارت کی، ابتک لڑکپن کی باتیں کرتے ہو"۔ میں نے شرم آلود لہجے میں نظریں جھکا کر جواب دیا۔

"آہ، وہ ایام بےفکری بھولنے کی چیز نہیں"۔ بجمی نے گہرا سانس لیکر کہا۔

"بس بس رہنے دو اپنی شاعری کچھ سناؤ، اس وقت میں گانا سننے کی موڈ میں ہوں"۔ میں جلدی سے بولی۔

"بہت بہتر سرکار!" بجمی نے شرارت سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ اور پھر دھیمے لہجہ میں میٹھے سُروں سے ایک گیت گنگنانے لگا۔

لیکن گیت کو ختم کرکے فوراً ہی وہ بولا۔ "عذرا ایسا نہ ہو پھوپھی زہرا نے میری آواز سن لی ہو اور وہ پھر نصیحت کرنے کو دوڑی آئیں۔ اس لئے جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ حالانکہ دل تو نہیں چاہتا۔ کہ تمہیں افسردہ چھوڑ کر جاؤں لیکن مجبوری ہے"۔

میں بھی پھوپھی کے خیال سے خوفزدہ ہو گئی۔ اور میں نے کہا۔ "ہاں ہاں جاؤ۔ خدا حافظ! اب کھانے کے وقت تو ملینگے ہی، اب میں ٹھیک ہوں فکر نہ کرو۔

بجمی چلا گیا اور مجھے اپنی اس بے کیف زندگی پر بہت افسوس ہوا اور دل بھر آیا تھا۔ اسلئے میں بہت دیر تک آنسو بہاتی رہی۔

اسی امید و بیم کی حالت میں دن گزرتے رہے۔ اور میں رنج و غم کھانے کی کچھ عادی سی ہو گئی۔ اس لئے اب بظاہر میری طبیعت سکون

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

پذیر تھی۔ لیکن یہ خیال بعض اوقات مجھے دیوانہ بنا دیتا تھا کہ کہیں تجمی سے میں زبردستی جدا نہ کر لی جاؤں۔ لیکن پھر والد کی گفتگو کا خیال ڈھارس بندھا دیتا۔ جو انہوں نے پھوپھی سے کی تھی۔

اپنی اٹھارہویں سالگرہ کے روز میں بے انتہا خوش تھی کیونکہ میری سالگرہ سے چند روز قبل تجمی نے ایک تصویر پر پہلی مرتبہ اوّل درجے کا انعام حاصل کیا تھا اور مجھے سالگرہ کے تحفے میں ایک خوبصورت ارغوانی رنگ کی ساڑھی لاکر دی تھی۔ جس کے کناروں پر سنہری مقیش سے انگور کی بیل بنی ہوئی تھی۔ ہم دونوں ان دنوں سب کلفتیں بھلا کر بہت مسرور تھے۔ میں نے اپنی دانست میں معمولی طور پر بالوں کو سنوارا۔ اور تجمی کی لائی ہوئی ساڑھی پہن کر اپنے کو آئینے میں دیکھا تو خود شرما گئی۔ سرخ و سفید رنگت۔ موزوں خط و خال، گنجان پلکیں، نیلگوں بھوری سیاہی مائل آنکھیں سنہری لانبے بال۔ اور ان کی دو لمبی لمبی چوٹیاں ارغوانی ساڑھی سے مل کر عجب بہار دکھا رہی تھیں۔

ہیرے کی مرصع چوڑیاں میری کلائیوں میں تڑپ رہی تھیں۔ اور کان کی لو میں ہیرے کے آویزے میری صراحی دار گردن کو مس کر کے بیقرار ہو ہو جاتے تھے۔ گلے میں بیش بہا ہیروں کی ہیکل نظروں کو خیرہ کر رہی تھی۔ ساٹن کے نہایت خوبصورت چست سلے ہوئے بلاؤز نے متناسب اعضا میں اور بھی دلکشی پیدا کر دی تھی۔ میں ابھی کھڑی سوچ رہی تھی۔ کہ اس ساڑھی اور زیور کو اتار ڈالوں۔ کہ آئینے میں تجمی کا شاندار عکس نظر آیا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا۔ نجمی حسن و وجاہت کا ایک مجسمہ تھا۔ اور اس وقت وہ جس شان و شوکت سے داخل ہوا۔ اس سے ایک فوجی جرنیل معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ہر انداز سے بانکپن ٹپک رہا تھا۔ گہرے سیاہی مائل نیلے رنگ کا کوٹ اس کے نکھرے ہوئے چہرے کی آب و تاب کو دوگنا کر رہا تھا میری نظریں اس کی حسین و شریر آنکھوں کا زیادہ دیر مقابلہ نہ کر سکیں اور نیچے جھک گئیں۔

"معاف کرنا عذرا میں بغیر اجازت تمہارے لباس خانہ میں گھس آیا۔ لیکن یہ ہار اگر گلے میں نہ ڈالا جاتا تو آج تمہارے سنگھار کی تکمیل نہ ہوتی"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے موتیا اور گلاب کا ایک خوشنما ہار میرے گلے میں ڈال دیا۔ جو میرے قدموں سے ذرا ہی اونچا تھا۔ اور میز پر سے ایوننگ ان پیرس سینٹ کی شیشی اٹھا کر مجھ پر چھڑکنے لگا۔

میں نے بگڑ کر کہا۔ "یہ کیا حماقت ہے؟ ایک تو تم چوروں کی طرح میرے لباس خانے میں گھس آئے اور پھر یہ شرارت کر رہے ہو!"

"اوہ، تمہاری مثل وہی ہے، الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ چور تم ہو کہ میں، چلو غصہ تھوک دو ہم ہاتھ جوڑے لیتے ہیں" اس نے شرارت بھرے لہجہ میں کہا، میرے لبوں پر مسکراہٹ آگئی اور میں نے کہا "چلو شریر باتیں نہ بناؤ"۔

"مذاق جو کرے وہ کافر، تم تو اس وقت دنیا کے شعر و شاعری کی تخلیق کا ایک نادر نمونہ معلوم ہوتی ہو۔ اللہ اللہ تابانیٔ حسن اور تمہارے کا فرِ شباب کا عالم مجھے توڑ رہے۔ کہ کسی کی نظر نہ لگ جائے"۔ نجمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

بیں نجمی کے مذاق سے چڑ گئی تھی، ٹھوڑی چڑھا کر بولی "کیوں جھوٹ بک رہے ہو! " اگر میں جھوٹا ہوں تو آئینہ تو سچا ہے، اس سے دریافت کر لو۔ تمہارا عکس میرے الفاظ کی تصدیق کر دیگا۔" نجمی نے ذرا سنجیدہ ہو کر کہا۔

" ہونہہ، تم کو تو بنانے کی عادت ہے، تمہارے منہ کون لگے۔ چلو باہر نکلو گے بھی یا یونہیں کھڑے باتیں بناؤ گے۔ چار بجنے والے ہیں"۔ میں نے آہستہ سے جواب دیا اور ہم دونوں ہال میں چلے گئے۔

خوشی اور موزوں سنگار نے میرے حسن و شباب کو دوچند کر دیا تھا۔ اور آج میں سب کی نگاہوں کا مرکز بن کر رہ گئی۔ میں گھبرا رہی تھی اور نجمی میری اس گھبراہٹ پر مسکرا رہا تھا۔ بار بار دزدیدہ شوخ نظریں ڈال کر مجھے شرمندہ کر دیتا تھا۔ خدا خدا کر کے شام کے بعد مہمان رخصت ہوئے اور میں جو ہجوم نگاہ سے گھبرا گئی تھی، وحشی ہرن کی طرح باغ میں بھاگ گئی۔ ہمارے وسیع اور خوبصورت باغ پر آج عجب بہار تھی۔ چودھویں کا چاند اپنی نور آگین شعاعوں سے عالم پر تسلط جمائے ہوئے تھا۔

میں جھیل کے قریب مرمریں بنچ پر بیٹھ گئی۔ میرے پاؤں سے جھیل کا پانی ٹکرا رہا تھا اور میں اس رومانی فضا میں کھوئی ہوئی سی تھی کہ کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں سمجھ گئی نجمی کے سوا کون ہوگا؟ اور میں نے منہ کو پیچھے پھیرے بغیر کہا۔ "یہ تم سائے کیطرح کیوں میرے ساتھ ساتھ پھرتے ہو؟"

"لیکن سایہ اپنے جسم سے جدا ہو کیسے سکتا ہے؟" نجمی نے جلدی سے جواب دیا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"ہوش کی باتیں کرو ہوش کی، آخر تم کو یہاں آنے کی ضرورت کیا تھی؟"
میں نے ترش لہجے میں کہا۔

"باغ پر تمھارا قبضہ نہیں ہے، ہم کیوں نہ آئیں؟" بجّی نے ہنستے ہوئے کہا۔
میں اب اپنے بناوٹی غصے کو قائم نہ رکھ سکی اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
بجّی میرے قریب بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ اس کے طویل سکوت سے گھبرا کر میں نے کہا۔ "یہ کیا سوچ رہے ہو؟"

"آنکھیں مصروف ہیں اسلئے زبان خاموش ہے۔" بجّی نے جواب دیا

"پھر وہی چھیڑ خانی"۔ میں نے چڑ کر کہا۔

"بھئی مذاق نہیں یہ حقیقت ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ وہ ....."
اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"تم بات کہتے کہتے رک کیوں گئے؟" میں نے سوال کیا۔

"تمہاری برہمی کا رعب غالب ہے۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا

"ایسے تو تم ڈرنے والے نہیں شریر کہیں کے۔ ایسی کیا بات ہے۔ جو میں ناراض ہو جاؤں گی، کہو تو سہی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"بغیر بات کہے تو تم خفا ہو جاتی ہو۔ اور یہ تو واقعی بات ہی ایسی ہے کہ تم کو غصہ آجائیگا۔" بجّی نے سنجیدہ لہجے میں بھولا منہ بنا کر کہا۔

"واہ یہ پیش بندی سے کرنے سے کیا فائدہ، بات بتاؤ گے بھی، یا یونہی پانی پر پاڑ باندھ رہے ہو۔" میں جلدی سے بولی۔

پاڑ تو پانی پر باندھی جاتی ہے۔ اس میں شک ہی کیا ہے۔ وہ ہنس

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کر بولا۔

" پھر فضول بکواس! سیدھی طرح باتیں کرو یا یہاں سے چلے جاؤ۔" میں نے تنک کر کہا۔

" ارے ارے اتنا ظلم۔ لو خفا نہ ہو۔ میں کہنا چاہتا تھا۔ کہ اب ہم تم جلد جُدا ہو جائیں گے۔" بجمی نے سنجیدگی سے کہا۔

" کیوں جُدا ہو جائیں گے؟" میں ذرا پریشان ہو کر بولی

" عذرا! اب تم اٹھارہ سال کی ہو گئیں۔ تمہاری شادی اب ایک دو سال میں ہو جائیگی۔ اور تم بیگم بن جاؤ گی اور غریب بجمی کو بھول جاؤ گی۔"

" میں شادی نہ کرونگی"۔ میں نے لجا کر کہا۔

" یہ کیسے ممکن ہے خاندانی اعزاز اور نام نہاد عزت کی خاطر تم کو شادی کرنی ہو گی۔ کہیں مشرقی لڑکیاں ناکتخدا رہ سکتی ہیں؟" بجمی نے جواب دیا

میں نے چند لمحے کے سکوت کے بعد کہا۔ " مگر میں شادی نہیں کرونگی۔ میں تم سے سچ کہہ رہی ہوں بجمی!"

" گویا شادی کرنی نہ کرنی تمہارے اختیار میں ہے۔" بجمی نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

" اور پھر کس کو میری شادی کا اختیار ہے؟" میں نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔

" تمہارے سرپرستوں کو!" بجمی فوراً بولا

" لیکن میرے والدین زندہ نہیں ہیں، اور اب میں بالغ ہوں۔ اور

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اپنی مرضی کی مختار آپ ہوں۔" میں نے رُک رُک کر کہا۔

" مگر تم کو شاید اِس بات کا علم نہیں کہ تمہارے والد کی وصیت ہے کہ تم جعفر سے منسوب کی جاؤ!" نجمی نے چست لہجے میں کہا۔

" میرے والد کی وصیت، تم نے کس سے سُنا؟" میں نے سوال کیا

" زہرا پھوپھی سے، آپا ناہید اور خود جعفر سے"۔ نجمی نے جواب دیا

" زہرا پھوپھی تو یونہی گلفشانی کرتی رہتی ہیں اور آپا ناہید کو ہاں میں ہاں ملانے کی عادت ہے۔ رہے جعفر تو ان کی بے تکی ہانک بھی اپنی اماں جان کے کہنے کی بدولت ہے، مجھے ان میں سے کسی کے کہنے سننے کی پرواہ نہیں ہے والد نے ہرگز اس قسم کا کوئی معاہدہ نہیں کیا۔ البتہ پھوپھی زہرا کی یہ خواہش تھی لیکن والد نے صاف کہدیا۔ کہ میں عذرا کی مرضی کے خلاف یہ رشتہ نہیں کروں گا۔" میں نے مطمئن لہجے میں کہا۔

" عذرا آج تم نے میرے دِل سے فکر کا ایک بھاری پتھر ہٹا دیا۔ بخدا جس دن سے میں نے یہ سُنا تھا، زندگی میرے لئے ایک ویران خواب بن گئی تھی۔ لیکن اِس خواب کی تعبیر نہایت دلکش نکلی۔ تم کسی کی پابند نہیں ہو، یہ کس قدر مسرت افزا بات ہے۔" نجمی مسرور ہو کر بولا۔

" ہاں میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔" میں نے فخریہ لہجہ میں کہا

" کسی سے نہیں، مجھ سے بھی نہیں؟" نجمی نے سہما ہوا لہجہ بنا کر، اور دست بستہ ہو کر کہا۔

" یہ کیا دیوانوں کی سی حرکتیں کر رہے ہو"۔ میں ذرا الجھا کر بولی۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"اِس میں میرا قصور نہیں۔ تم شادی سے انکار کر کے مجھے دیوانہ بننے پر مجبور کر رہی ہو"۔ نجمی نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔

"میرے اللہ! تم نہیں مانو گے، چلے جاؤ یہاں سے!" میں نے ذرا برہم ہو کر کہا۔

"نہیں جاتے ہم یہاں سے۔ جب تک تم اِس انکار کو اقرار سے نہ بدل دو"۔ نجمی نے شوخ لہجے میں کہا۔

"نہیں کرتی میں اقرار، یہ بھی کوئی زبردستی ہے"۔ میں جلدی سے بولی۔

(تھوڑے سکوت کے بعد) "مذاق نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے، میری تعلیم کا یہ آخری سال ہے۔ پھر مجھے اپنے آرٹ کو مکمل کرنے کے لئے دو سال کے واسطے کلکتے جانا پڑے گا۔ اِس کے بعد انشا اللہ ایک فن کار کی حیثیت سے دنیا کی نظروں میں وہ وقعت حاصل کر سکوں گا۔ جو تم جیسی دیوی کے پجاری کے لئے ضروری ہے"۔ نجمی نے ذرا سنجیدہ ہو کر کہا۔

"یہ کیا لے تکی ہانک رہے ہیں نہیں سمجھی!" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ واقعی اگر تم مجھے مدت العمر کے لئے خادم بنانا چاہتی ہو تو جب تک میں کلکتے سے واپس آؤں بالکل خاموش رہو۔ ورنہ اگر تم نے مخالفت کی تو زھر اکیپوچپی زندگی دشوار کر دینگی۔ ع۔ جوابِ جاہلاں باشد خموشی"۔ نجمی نے رازداری کے انداز میں کہا۔

"میں تمہارے کہنے پر عمل کروں گی"۔ بیساختہ میرے منہ سے نکلا۔ اور میرا سر شرم سے نیچے جھک گیا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

بجمی فرطِ مسرت سے اچھل پڑا اور اُس کا حسین چہرہ شگفتہ پھول کی مانند کھل گیا۔ گلاب کے پھول توڑ کر اُس نے میرے بالوں میں سنوارے اور بولا۔ "آؤ عذرا کشتی میں ذرا سیر کریں آج کی رومان انگیز فضا میں کشتی کی سیر کا لطف نہ اٹھانا گویا قدرت کی توہین کرنا ہے۔"

"مجھے یہاں آئے کافی دیر ہو گئی ہے۔ کہیں زہرہ پھوپھی کو معلوم ہو گیا کہ میں اور تم باغ میں تنہا ہیں تو غضب ہو جائے گا۔" میں نے شرم آلود لہجے میں کہا۔

"زہرہ پھوپھی نہ آئیں گی ان کی چہیتی سہیلی زبیدہ خانم ابھی تک ہیں ہیں۔ اور وہ ان سے باتوں میں مصروف ہیں" بجمی نے مطمئن ہو کر جواب دیا۔ ہم کشتی میں بیٹھ گئے۔ بجمی کشتی کھینے لگا۔ ہماری خوبصورت کشتی جھیل کے کنولوں سے اٹکھیلیاں کرتی چلی جا رہی تھی۔ بجمی گنگنا رہا تھا

پریم کی نیّا —— پریم کھویّا

پریم ہی کھیون ہار

پریم کی آئی بہار

میں مخملی تکیوں کے سہارے کشتی میں بیٹھی ہوئی ماہتاب کی جانب ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔ عنبر بیز ہوائیں میرے بالوں سے کھیل رہی تھیں۔ بجمی کی نغمہ نوازی پر میری روح کا ہر تار رقص کر رہا تھا۔ وہ خود اس وقت ایک دیوتا معلوم ہو رہا تھا۔ میں ایک نگاہ غلط انداز اس پر ڈال لیتی اور پھر چاند کو تکنے لگتی۔ میرے جسم میں کیف و سرور کا ہلکا سا ارتعاش تھا آنکھوں

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

میں انبساط انگیز خمار، ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا میں اس دنیا سے دُور ایک اور عالمِ رنگ و بو کی نعطر آنگیز فضا میں سانس لے رہی ہوں۔

اِس کے بعد میری وُہ افسردگی جو روح پر ہر وقت طاری رہتی تھی بالکل غائب ہوگئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے سوا نہ کچھ دیکھتے تھے نہ سنتے تھے۔ محبت کے نشے نے ہمیں دلیر بھی کر دیا تھا۔ اور اب اکثر میں اَور بجّی گھر والوں کی نظریں بچا کر مِلتے رہتے تھے۔ افسوس یہ کیف انگیز دَور چند مہینے ہی رہا۔ بجّی نے بی۔ اے میں نہ صرف امتیازی طور پر نمبر لئے۔ بلکہ یونیورسٹی بھر میں اوّل آیا۔ اِس کی یہ کامیابی میرے لئے مسرور کن تھی لیکن اس کی دُوری خیال بھی رنجدہ تھا۔

بجّی نے نتیجہ نکلنے کے بعد ہی کلکتے جانے کے لِئے طیاریاں شروع کر دیں اور ضروری خط و کتابت کے بعد اس نے سامانِ سفر درست کرلیا۔ ماموں جان بجّی کو صرف سو روپے ماہانہ کی قلیل رقم بھیجتے تھے۔ اس میں انہوں نے شروع سے لیکر اس وقت تک کمی بیشی نہ کی تھی۔ بجّی اتنا خود دار تھا۔ کہ اس نے ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی اپنے باپ کو اِس کے متعلق ایک لفظ بھی نہ لکھا۔ والدہ نے ماموں کا بجّی کے ساتھ یہ سرد مہری کا برتاؤ دیکھ کر جہیز میں جو جائداد ان کو مِلی تھی۔ وہ اُس کے نام لکھدی تھی۔ اُس کی آمدنی دو ہزار سالانہ کے قریب تھی۔ اور یہ رقم تھوڑی ہی تھی۔ جس میں بجّی کو اپنے تمام اخراجات پورے کرنے پڑتے تھے۔ جب تک والد زندہ رہے۔ بجّی کا لباس وہ بنا دیتے تھے۔ اُن کے بعد کون پوچھتا —— لیکن بجّی کا

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

رکھ رکھاؤ قابلِ تعریف تھا۔ اس کے پاس ہمیشہ ایسا لباس نکلتا تھا۔ کہ میاں جعفر جو اپنی ماں کے اتنے لاڈلے تھے تعریف کرتے رہ جاتے، کلکتے جاتے وقت میں نے بہت چاہا۔ کہ نجمی مجھ سے کچھ روپیہ لے لے۔ کیونکہ وہاں قیام و طعام کے بند و بست کیلئے کافی روپیہ درکار تھا۔ لیکن نجمی کی غیور طبیعت بھلا کسی کا مرہونِ احسان ہونا کیوں گوارا کرتی۔ اُس نے مجھ سے ایک پیسہ لینا بھی قبول نہ کیا۔ ممانی جان مرحومہ کا زیور اور کچھ نقد روپیہ اُس کے نام بنک میں تھا۔ زیور وہ سب میرے پاس رکھوا گیا۔ اور روپیہ لے گیا۔

نجمی کے چلے جانے کے بعد میں افسردہ رہنے لگی۔ میرا وقت زیادہ تر افسانہ نویسی میں گزرتا تھا۔ اپنے کمرے سے میں شاذ و نادر ہی نکلتی تھی اس طرح ایک سال گزر گیا۔ نجمی اس عرصے میں صرف دو مرتبہ دو تین ہفتوں کے لئے آیا۔ اُس کے کلکتہ جانے کے بعد زہرہ پھوپھی خلافِ عادت مجھ پر بہت مہربان ہو گئی تھیں اور نجمی جب چند ہفتوں کے لئے آیا۔ تو اس کی خوب تواضع کی۔ میں خوش تھی کہ چلو پھوپھی اب ٹھیک ہو گئیں۔ اور یہ خلش بھی گئی۔

ایک دن سہ پہر کو میں اداس تھی۔ کیونکہ نجمی کا خط کئی روز سے نہ ملا تھا۔ طرح طرح کے پریشان خیالات ستا رہے تھے۔ اس لئے چائے بھی میں نے اپنے کمرے میں منگوا لی۔ سب کے ساتھ نہیں پی۔ ابھی میں چائے ختم کر کے بیٹھی ہی تھی کہ جعفر آ گیا۔ اور اُس نے اچانک ذرا طنزیہ لہجے میں کہا۔ کیسی ہو عذرا جو چائے کمرے میں منگوائی۔ تمہاری صورت تو اب

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

بہت کم دکھائی دیتی ہئے"؟

"ذرا طبیعت سُست ہے۔ اس لیئے باہر نہیں نکلی۔ آیئے تشریف رکھیئے بھائی!" میں نے کہا۔

"تم میرے ساتھ اِس قدر تکلّف کیوں برتتی ہو عذرا؟" جعفر نے کہا

"کیسا تکلّف"؟ میں نے کہا

"یہی آپ، جناب، بھائی وغیرہ کہنے کا!" جعفر نے جواب دیا

"آپ مجھ سے چار سال بڑے ہیں۔ پھر میں کیسے آپ کا ادب نہ کروں"

مَیں حیران ہو کر بولی۔

"لیکن عذرا، تم کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ آئندہ میرے اور تمہارے درمیان تعلقات جو صورت اختیار کرنے والے ہیں۔ ان کا اقتضا ہے۔ کہ تم مجھ سے محبت کرو نہ کہ میرا احترام" جعفر نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

"میں آپکی گفتگو کا مطلب نہیں سمجھی۔ معاف کیجیئے، میں نے اپنے، بزرگوں کا احترام کرنے کی تربیت پائی ہے۔" مَیں نے جواب دیا۔

"لیکن جو تمہارے بزرگ ہوں، ان کا احترام کرو، میں تو تمہارا منگیتر ہوں۔" جعفر نے مسکرا کر گستاخ لہجے میں کہا۔

میں اِس خلافِ توقع گفتگو کے لئے تیار نہ تھی۔ اس لِئے دم بخود ہو گئی۔

"تمہاری اِس خاموشی کا کیا مطلب ہے؟ تم کو میرا یہ کہنا ناگوار گزرا ہے؟" جعفر نے سوالیہ انداز میں کہا۔

میں اب سنبھل گئی تھی، بگڑ کر بولی۔ "ناگوار ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

میں اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے تیار نہیں"۔

"اس لئے کہ تم نجمی کو مجھ پر ترجیح دیتی ہو، کیوں ٹھیک ہے نا عذرا ؟"
جعفر نے تلخ لہجے میں کہا۔

"مجھے آپ کے الفاظ کی تردید کرنے کی چنداں ضرورت نہیں"۔ میں نے
ذرا رُک کر جواب دیا۔

"لیکن تم کو اُس مفلس قلاش سے بیاہ کرنے کی اجازت کون دیگا ؟" جعفر
نے کرخت لہجے میں کہا۔

"کسی کو میرے متعلق سوچنے کا کوئی حق نہیں۔ میں اپنی مرضی کی آپ
مختار ہوں، مہربانی کر کے فضول بکواس نہ کیجئے۔ میں اب کچھ نہیں سننا چاہتی۔
آپ میرے کمرے سے باہر چلے جایئے"۔ میں غم و غصہ سے کانپ کر بولی۔

"مجھے حق ہے یا نہیں یہ تم کو کچھ دن بعد معلوم ہو جائے گا"۔ یہ کہتا ہوا
جعفر کمرے سے نکل گیا۔

میرا دل اس وقت جعفر کی لایعنی گفتگو سے بگڑ گیا۔ پہلے ہی میں پریشان
بیٹھی تھی۔ اسلئے میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ اور نہ جانے کب تک صوفے
پر گر کر روتی رہی۔ روتے روتے ہی آنکھ لگ گئی۔

یکایک نرگس نے مجھے آ کر بتایا کہ نجمی آ گئے ہیں۔ اور گھر کے سب لوگ
شام کی تفریح کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ اسلئے وہ آپ کے پاس آنا چاہتے ہیں
نجمی کے آنے کی خبر نے مجھے بے اندازہ مسرت پہنچائی۔ میرا دل فرطِ
مسرت سے دھڑکنے لگا۔ شرم و خوشی کے ملے جلے جذبات نے رخساروں کو سُرخ

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کر دیا۔ جلدی جلدی منہ پر سرد پانی کے چھینٹے دے کر تولیے سے صاف کیا۔ بگڑے بالوں کو سنوارنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی کہ بجمی حسب عادت گنگناتا ہؤا داخل ہؤا ؏

کرم کی یہ مجبوریاں اللہ اللہ!
نظر سے دلاسے دیئے جا رہے ہیں

صوفے پر بیٹھتے ہی میری جانب غور سے دیکھ کر اُس نے گھبرا کر کہا۔

"خیر ہے عذرا؟ تمہاری آنکھیں کیوں سُوجی ہوئی ہیں۔ کیا تم رو رہی تھیں؟"

"نہیں تو۔ تمہارا وہم ہے۔ میں تو ذرا سو گئی تھی۔ اِس لئے آنکھیں بھاری ہو گئی ہونگی۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا

"تم بجمی کو دھوکا نہیں دے سکتیں شریر لڑکی! میرا قیاس غلط نہیں ہو سکتا۔" اُس نے اپنی شوخ آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر کہا۔

"تم کو اِس قدر میرا فِکر کیوں ہے؟" مَیں نے چِڑ کر کہا

"لو بھلا ہم اپنی ننھی منھی عذرا کا فِکر کیسے نہ کریں؟" بجمی نے مسخرا منہ بنا کر کہا۔

"آہا اِسوقت تو تم خاصے بھانڈ معلوم ہو رہے ہو۔" میں ہنسکر بولی

"خدا سلامت رکھے ایسی سرکاروں سے تو اپنا دم بنا ہؤا ہے۔" بجمی نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"آج کچھ پی آئے ہو جو یوں بہک رہے ہو۔" میں نے ذرا تنک کر جواب دیا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"میں ایسی ہی باتیں کروں گا۔ جب تک تم اپنے رونے کا سبب نہ بتاؤگی۔" نجمی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"میں تمھارا خط نہ ملنے سے افسردہ سی تھی۔ اس پر طُرّہ جعفر بھائی کی بے موقع گفتگو ہوئی۔ میرا دِل بھر آیا۔ اور مَیں رونے لگی۔" میں نے سر جھکا کر آہستہ سے جواب دیا۔

"جعفر نے کیا کہا۔ جو تم رو دیں۔ کچھ بتاؤ تو!" نجمی جلدی سے بولا

"یہی کہ مَیں تمھارا منگیتر ہوں، تم مجھ سے محبت کرو وغیرہ وغیرہ ــــــ آپ مجھ سے ایسی فضول باتیں نہ کریں۔ میں نے جعفر سے کہا۔" میں رُکتے رُکتے بولی۔

"پھر جعفر نے کیا کہا؟" نجمی نے سوال کیا۔

"وُہ بولے۔ تم مجھ پر نجمی کو ترجیح دیتی ہو"۔ مَیں نے کہہ دیا۔ میں اس کی تردید کرنی نہیں چاہتی۔ یہ سن کر وُہ بہت برہم ہوئے اور خوب جلی کٹی سنا گئے۔ ان کی بیہودہ باتوں سے مجھے رنج ہوا اور مَیں رو پڑی۔"

"آخر ہونا لڑکی! جب ہی تو رو دیں، اس میں بھلا رونے کی کیا بات تھی؟" جعفر نے ہنسکر کہا۔

"ہاں میری صورت تو لسورتی ہوئی سی ہے"۔ میں نے جل کر جواب دیا۔

"ایں ایں خفا نہ ہو جاؤ۔ تم تو بس مذاق میں بگڑ جاتی ہو۔ چلو اب غصے کو تھوک دو۔ دیکھو۔ تمھارے لیئے میں کیسی نادر چیز لایا ہوں۔ میرے اعلیٰ مذاق کی داد دو۔" یہ کہکر نجمی نے جیب سے ایک چھوٹا سا پیکٹ نکالا

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کاغذ کی تہوں کو کھول کر ایک بکس میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس بکس میں ایک چھوٹی سی سونے کی مینا کار ڈبیا تھی۔ جس کے ڈھکنے پر کیوپڈ کی سچی سیپ سے بنائی ہوئی ننھی سی مورت تھی۔ وہ اپنا تیر کمان سنبھالے اپنے پَر اس طرح پھیلائے کھڑا تھا۔ گویا اب تیر چلایا ہی چاہتا ہے۔

مجھے یہ ڈبیا دل سے پسند آئی۔ اظہارِ خوشی اور شکریے کے طور پر میں نے اپنا سر اس کے خوبصورت شانے پر رکھ دیا۔

بجمی کے کلکتے سے واپس آنے میں اب تین ماہ باقی رہ گئے۔ میں خوش تھی کہ میری پُرمسرت زندگی کے آغاز کا زمانہ اب قریب ہے اور یہ دن میں گن گن کر گزار رہی تھی۔ اپنے سنہری مستقبل کے اکثر رنگین خواب دیکھا کرتی تھی۔ پر آہ، ان خوابوں کی تعبیر —— اس کا تصور بھی دل کو لرزا دیتا ہے۔ گھر میں ان دنوں میری شادی کا تذکرہ ہی موضوعِ گفتگو بن کر رہ گیا تھا۔ اور پھوپھی زہرا تو کتنے دنوں سے اس کا اعلان کر رہی تھیں کہ میں جعفر کی منسوبہ ہوں لیکن میں ایسی انجان بنی ہوئی تھی گویا یہ بات میرے علم میں ہی نہیں ہے۔ جہاں یہ ذکر شروع ہُوا۔ میں نے دوسرا ذکر چھیڑ دیا۔ میری سہیلیوں کے ذریعے پھوپھی نے بارہا میرا عندیہ دریافت کرنا چاہا۔ لیکن میں نے ہمیشہ مذاق میں ٹال دیا۔

ایک شام کو جب ہم سب ٹینس کھیل چکے۔ تو ناہید آپا نے کہا۔ "عذرا مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں آؤ اِدھر جھیل کے کنارے بیٹھ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "فرمایئے"۔ اور میں اس بنچ پر بیٹھ گئی جہاں بجمی سے میں نے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

پیمانِ محبت کیا تھا۔

"تم سنجیدگی سے جواب کیوں نہیں دیتیں عذرا!" ناہید آپا نے متین لہجے میں کہا۔

"کِس بات کا آپا؟" میں نے سوال کیا۔

"اپنی شادی کی بابت تمھارا کیا خیال ہے؟" اُنھوں نے جواب دیا

"ابھی تو اس کے متعلق میں نے کوئی خیال قائم نہیں کیا، ایسی جلدی کیا ہے۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"چند مہینے بعد تم اکیس سال کی ہو جاؤ گی۔ اور ہمارے خاندان میں تمھارے علاوہ کوئی لڑکی اتنی عمر تک بن بیاہی نہیں رہی۔ یہ بڑی معیوب بات ہے کہ اب بھی لیت و لعل کی جائے۔" ناہید آپا نے کہا۔

"میں اپنی اکیسویں سالگرہ پر آپ کو اس کے متعلق رائے قائم کر کے بتا دوں گی اور اس مسئلے پر اب غور کروں گی۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا

"مگر اس کے متعلق سوچنے کی تو تم کو ضرورت ہی نہیں۔ جعفر لڑکپن سے تمھارا منگیتر ہے۔" آپا نے کہا۔

"یہ منگنی پھوپھی زہرا نے از خود قائم کر لی ہے۔ اور مجھ کو اس کے توڑنے کا حق ہے۔" میں نے طنز آمیز لہجہ میں جواب دیا

"پھوپھی نے نہیں والد نے خود یہ منگنی کی ہے۔ تم غلطی پر ہو عذرا!" ناہید آپا نے تنبیہ کے لہجے میں کہا۔

"آپ بھی پھوپھی کی باتوں میں آ گئی ہیں۔ والد جعفر جیسے چھچھورے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کُند ذہن بیوقوف لڑکے کے ساتھ کبھی میری تقدیر نہیں پھوڑ سکتے تھے۔"

میں نے چیں بر جبین ہو کر جواب دیا۔

"تم خواہ مخواہ ضِد کر رہی ہو۔ اور اپنے منگیتر کو بُرا بھلا کہہ رہی ہو اور یہ صرف اِس لئے کہ تم بخمی سے شادی کرنا چاہتی ہو۔" آپا نے خشک لہجے میں کہا۔

"شکریہ! کہ آپ نے حقیقت کو سمجھ لیا۔ بس اب آپ اس معاملے میں مداخلت نہ کریں۔" مَیں نے ترش لہجے میں کہا۔

"خوب! گویا مجھ کو تمھارے معاملے میں بولنے کا حق ہی نہیں۔" اُنھوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"آپ کو بولنے کا حق تو ہے مگر کُند چھری سے مجھ کو ذبح کرنے کی کوشش تو نہ کیجئے۔ میں جعفر جیسے انسان کے ساتھ کبھی زندگی نہیں گزار سکتی۔ ان کے اور میرے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔" مَیں نے غمگین آواز سے کہا۔

"لیکن والد کی وصیت۔ خاندانی اعزاز اور بزرگوں کی لاج سب کو تم بخمی کی خاطر ٹھکرا دو گی؟" آپا نے گھبرا کر کہا۔ اور ان کی حسین آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔ میں آپا کے رونے سے متاثر ہو گئی۔ اور ذرا نرم لہجے میں کہا۔ "مگر والد کی وصیت کا ثبوت؟"

"اِس کا ثبوت ان کی وفات سے چند روز قبل کا ان کا وصیت نامہ ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے۔ کہ ان کا نِصف الاثاثہ معہ خطاب شاہزادگی

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

جعفر کو دیا جائے اور تمھاری شادی جعفر کیساتھ کی جائے۔" آپا نے جواب دیا۔

مجھے زمین و آسمان گھومتے ہوئے معلوم ہوئے۔ دُنیا میری نظروں میں تاریک ہوگئی ـــــ محبت اور فرض میں جنگ چھڑ گئی۔ آخر مشرقی شرم خاندانی اعزاز کا خیال اور سب سے زیادہ مرحوم باپ کی وصیت کا احترام محبت پر غالب آیا۔

" آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی آپا، مَیں اپنی محبت کو فرض کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دوں گی۔" مَیں نے طویل سکوت کے بعد گھٹے ہوئے لہجے میں رُک رُک کر بمشکل کہا ـــــ پھر مجھے یہ خیال آیا کہ اِسی جگہ میری محبت پھلی پھولی تھی اور یہیں اُس کا گلا گھونٹ دیا گیا ـــــ اِس تصور سے میرا سر چکرا گیا۔ اور میں بیخود ہوگئی۔ جب مجھے ہوش آیا۔ تو میں اپنے کمرے میں تھی اور ڈاکٹر میرے دل کی حالت کا آلے سے معائنہ کر رہا تھا۔ دنوں میں صاحبِ فراش رہی۔ متواتر غشی کے دَورے پڑتے تھے۔ میرے شب و روز یکسر مدہوش تھے۔ میری علالت کی خبر پاکر جعفر بھی آگیا اور میری تیمارداری بہت محبت سے کرنے لگا۔ اُس کی عنایت اور محبت مجھے اور بھی رنج پہنچاتی تھی۔ اور اس خیال سے دل پھٹا جاتا تھا کہ اسکو یہ خبر کس طرح دوں گی۔ کہ میں اب مجبور ہو کر پیمانِ محبت توڑ رہی ہوں۔ آخر رفتہ رفتہ میں سنبھل گئی ؎

درد کی بیدردیاں آخر بدرماں ہو گئیں
مشکلیں اتنی پڑیں ہم پر کہ آساں ہو گئیں

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

غسلِ صحت کے ایک ہفتہ بعد میں لائبریری میں بیٹھی یونہی ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی کہ نجمی آ گیا۔ آج صبح ہی سے میں نے عزم کر لیا تھا کہ ضرور یہ منحوس خبر اس کو سُنا دوں گی۔ اور زیادہ دِن اُسے دھوکے میں نہ رکھوں گی۔

"آج کیسا گرم دِن ہے۔" میں نے گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا

"ہاں، اور تمھاری صحت پر اِس سال موسمِ گرما کی حدّت نے بہت بُرا اثر کیا ہے۔" نجمی نے محبت بھرے لہجے میں جواب دِیا۔

"نہیں موسم نے تو نہیں، البتہ ایک خاص واقعہ نے مجھ کو بہت متاثر کیا ہے۔" میں نے پست لہجہ میں کہا۔

"خاص واقعے نے؟ جلدی بیان کرو عذرا کیا بات ہے۔ میرا دم گھُٹ رہا ہے۔" نجمی گھبرا کر بولا۔

"والد کی وصیّت کے مطابق میری شادی جعفر سے ہو گی، تمھارا گمان صحیح تھا نجمی!" میں نے بھرّائے ہوئے لہجے میں بمشکل یہ الفاظ ادا کیے۔

"آہ، مجھے اِس کا ہر دم دھڑکا لگا رہتا تھا۔ میری بدنصیبی رنگ لے آئی۔" نجمی نے طویل سرد آہ بھر کر کہا۔ اور اُس کا رنگ ہلدی کی مانند زرد ہو گیا۔

کمرے کے ماحول پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ اور ہم دونوں عالمِ نزع کی سی بےچینی محسوس کر رہے تھے۔ دو دل ایک ساتھ بے قراری سے دھڑک رہے تھے۔ اور دھڑکتے دھڑکتے بند ہو جانا چاہتے تھے۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"خدا ہم دونوں کو ضبط کی توفیق دے۔ یہ زندگی ایک عذاب ہے۔ تم سے جدا ہونے کے بعد میرے لئے دنیا کی ہر ایک دلچسپی ایک بے معنی چیز ہو گی"۔ بہت دیر کے بعد نجمی نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اور میں تو یقیناً گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی"۔ میں گھبرا کر بولی

"نہیں نہیں عذرا! ایسے خیال کو دل میں جگہ نہ دو۔ میں تمھاری سلامتی کے لئے ہمیشہ دعائیں کرتا رہوں گا۔ خواہ ہم ساری عمر نہ ملیں لیکن تم زندہ رہو اور خوش رہو"۔ نجمی نے پُرخلوص دعائیہ انداز میں کہا

"میں تم کو اب بھول جانے کی کوشش کروں گی اور تم بھی مجھ کو بھول کر اپنی زندگی مسرور بنانے کی کوشش کرنا"۔ میں نے دل کو سنبھال کر کہا۔

"تم کو نہیں میں خود اپنے کو بھول جاؤں گا"۔ نجمی نے جواب دیا اور دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے اسکے رخساروں پر ڈھلک پڑے۔

مجھ میں اس یاس آمیز جملے کا جواب دینے کی سکت نہ تھی۔ اس لئے خاموش رہی۔ وہ بھی اب خاموش تھا اور اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ چند لمحے کے سکوت کے بعد اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ دبایا —— اس کا ہاتھ برف کی مانند سرد تھا۔ میں چونک پڑی اس نے دھیمی آواز سے خدا حافظ کہا۔ اور کمرے سے سر جھکائے نکل گیا۔

میں اب شدتِ غم سے بُت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد اسی طرح بے حس و حرکت کرسی پر بیٹھی رہی۔ خیالات کا سمندر میرے دل میں موجزن تھا۔ اور میں اس کی لہروں میں کھوئی ہوئی تھی۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

نرگس سہ پہر کی چائے میرے کمرے میں لائی تو اُس نے کہا۔ کہ "میاں نجمی کسی سے کچھ کہے سنے بغیر گھر سے چلے گئے"۔

میرے دِل کو کثرتِ رنج نے بے حس کر دیا تھا۔ یہ سن کر بھی میں خاموش رہی اَور میری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ گرا۔

نجمی نے جا کر مجھے خط نہ لکھا۔ اَور نہ میں نے ہی اِس کی جرأت کی۔ اِس کے خیال سے ہی میرا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ تمام تمام دِن خاموش اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی تھی۔ مجھے یہ بھی خبر نہ تھی کہ صبح کب ہوتی ہے۔ اور شام کب۔ موسم کی تبدیلی کا بھی مجھ پر اثر نہ تھا۔ زندگی کے دِن فضول گزر رہے تھے۔ گزرے چلے جا رہے تھے۔ میری منگنی کا اعلان اب سب عزیز و اقربا کے سامنے کر دیا گیا تھا۔ تمام محل میں ایک زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ہر متنفس خوش تھا۔ صرف ایک میں تھی جو غمگین و رنجیدہ اپنے کمرے میں پڑی اپنی ناشاد زندگی پر آنسو بہایا کرتی اور خدا سے موت کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔ لیکن موت بھی ہم جیسے بدنصیبوں سے دور رہتی ہے۔ میری افسردگی اَور خلوت نشینی کو شرم پر محمول کر کے خاندان کی بڑی بوڑھیاں میری تعریفوں کے پل باندھنے میں مصروف تھیں۔

زہرا پھوپھی اپنی کامیابی پر نازاں اَور آج کل بہت مسرور تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غصے کی شکل انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہر وقت شگفتہ و شادماں نظر آتی تھیں، لاڈلے بیٹے کی شادی کے چاؤ میں پچھلے رنجشوں کو بھلا کر اتنے عرصے بعد وہ مِرے بلائے سسرال بھی پہنچ گئیں۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

نواب صاحب بھی چہیتی بیگم کی صورت دیکھ کر ان کی پچھلی کج خلقیوں کو بھلا کر، نہایت تزک و احتشام سے بیٹے کی شادی کی تیاری کرنے لگے۔

ہمارے ہاں شادی کی تاریخ سے دو ماہ قبل ہی روزانہ خاندانی بزرگ بیگمات جمع ہوتیں اور جہیز کے لئے طرح طرح کے جوڑے سلتے۔ زیورات، اور برتن خریدے جاتے۔ بارات کی آرائش کے متعلق گرماگرم مباحثے ہوتے۔

مجھے ایک ہفتہ قبل مانیوں بٹھا دیا گیا اور مانجھے کے روز سے ہمارا وسیع محل مہمانوں کی کثرت سے ایسا بھر گیا۔ کہ تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ میرے کمروں میں میری شوخ اور چنچل سہیلیوں کا قیام تھا۔ جو ان دنوں ہر وقت مجھے گھیرے رہتی تھیں۔ اور ان شریروں کے شوخ و دلآویز لطیفوں کی بدولت اس عالم افسردگی میں کبھی کبھی میرے لبوں پر بھی ہلکا سا تبسم آ جاتا تھا۔ مانجھے بیٹھے مجھے کو تیسرا روز تھا کہ میری شوخ سہیلی شاہدہ "السٹریٹڈ ویکلی" کا تازہ پرچہ لئے ہوئے آئی اور کہنے لگی۔

"اری دیکھ! وہ تیرا ماموں زاد تو خوب مصوّر بن بیٹھا، اس میں اس کی تصویر نکلی ہے۔"

"لا دکھا تو کہاں ہے؟" میں جلدی سے بولی۔

"مانیوں بیٹھ کر کسی اور مرد کی صورت نہیں دیکھتے۔ اب اپنے دولھا کو دیکھیو!" شاہدہ نے چٹکی لے کر کہا۔

"خاک میں ڈال اس مانجھے کو" میں نے جھنجھلا کر رسالہ شاہدہ کے ہاتھ سے چھین لیا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

دو تین صفحے اُلٹنے کے بعد نجمی کی تصویر میرے سامنے تھی، اس کی پیشانی کی شکنیں صاف بتلا رہی تھیں کہ اس کے مطلع زندگی پر مایوسیوں کے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ خوبصورت آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے دلی بے چینی کے شاہد تھے۔ اس کی حسین سوگوار صورت اس عالم میں بھی دل کو بے اختیار کھینچ رہی تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا:۔

"مسٹر نجمی بی۔ اے جن کی بنائی ہوئی تصویر "غربت و محبت" نے پہلا انعام حاصل کیا۔"

پھر ایڈیٹر کا نوٹ تھا:۔

"مسٹر نجمی ہندوستانی نوجوان لیکن باکمال مصوّر ہیں۔ کلکتے کی فنون لطیفہ کی نمائش میں آپ کے شاہکار "غربت و محبت" نے پہلا انعام حاصل کیا۔ ہم مادرِ ہند کے اس نوجوان سپوت پر فخر کرتے ہیں۔ گو مسٹر نجمی ابھی بالکل نوعمر ہیں، انہوں نے اپنی عمر کی چوبیسویں منزل ابھی ختم نہیں کی ہے لیکن بلحاظِ فن ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ اس تھوڑے عرصے میں ان کے موقلم کی صناعیاں دیکھ کر اہل نظر اصحاب یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک دن ان کے فنی کمالات تمام دنیا سے خراج تحسین وصول کریں گے۔ یہ تصویر جو انہوں نے نمائش میں پیش کی ہے اپنی نوعیت کی جدا اگانہ تصویر ہے۔

ایک ویران جنگل ہے اور خزاں کا موسم، درختوں کی پتیاں جھڑ رہی ہیں اور چاروں طرف کہرا چھایا ہوا ہے۔ اس ہولناک سمے میں ننھا کیوپڈ آنکھوں پر ہاتھ رکھے شاید رو رہا ہے۔ اس کا ننھا برہنہ جسم سردی سے کانپ رہا ہے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ایک مفلوک الحال نازنین جس کے چہرے پر افلاس اور فاقہ کشی نے قبل از وقت شکنیں ڈال دی ہیں نہایت بے رحمانہ انداز سے دونوں ہاتھوں میں قینچی سمبھالے کیوپڈ کے پر کاٹنے کی کوشش کر رہی ہے

کون ہے ـــــ ؟ جوان کے اس نرالے تخیل اور جدتِ ذوق کی داد نہ دیگا۔"

بجمی کی تصویر دیکھ کر اور ایڈیٹر کا نوٹ پڑھ کر میں غم کے اتھاہ سمندر میں غوطے لگانے لگی اور مجھے یہ خبر بھی نہ ہوئی کہ شاہدہ کب رسالہ لے گئی اور کیا ہوا۔

آخر کار وہ منحوس دن آ پہنچا۔ جس دن میری اور بجمی کی مفارقت پر دائمی مہر ثبت ہونے والی تھی۔ مجھے علی الصبح جگا دیا گیا۔ کیونکہ خاندانی رواج کے مطابق طلوعِ آفتاب سے قبل نکاح ہونا تھا۔ حسین صبح اپنی سحر سامانیوں کے ساتھ جلوہ نما ہو رہی تھی۔ دن بہت دلکش تھا۔ لیکن میں بہت مضطرب تھی ـــــ بے حد اُداس ـــــ میرے دل میں آج غیر معمولی بے چینی تھی اور ایک ناقابلِ اظہار تڑپ ـــــ شاید میں اپنے کو اس نئے ماحول سے ہم آہنگ نہ کر سکتی تھی۔ جس کے لئے مجھے طیار ہونا تھا۔ دریچے کا نیلا پردہ ہٹا کر میں نے باہر کی جانب جھانکا۔ سامنے سورج مکھی کا بڑا سا پھول ہوا میں ہل ہل کر نہ جانے زندگی کے کون سے راز کی تشریح کر رہا تھا۔

میں اپنی موجودہ زندگی کے اُلجھے ہوئے پلاٹ اور بھیانک مستقبل

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

پر ابھی غور کر رہی تھی۔ کہ یکایک آپا ناہید کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھیں "ایں عذرا تم ابھی تک دریچے میں بیٹھی ہو۔ ارے بھئی آج تو ذرا اپنی افسانویت کو اپنے سے الگ کر دو اور مشرقی رواج کی پابندی کرو"

ان کی ناصحانہ گفتگو کا میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور مسہری سے اٹھکر پھر اپنی مسہری پر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں کے بعد سارے محل میں گڑبڑ مچ گئی۔ ہر ایک خاتون ایسی بوکھلائی ہوئی تھیں۔ گویا پاگل کتے نے ابھی ابھی ان کو کاٹا ہے۔ میں اس کھلبلی سے گھبرائی کہ یا اللہ اب کیا بلا نازل ہونے والی ہے۔ معلوم ہوا کہ ایجاب وقبول کے وکیل اور گواہ اندر آتے ہیں اس لئے ہر بیوی پردے کے انتظام میں مصروف ہے۔ میرے اردگرد بڑی بوڑھیوں کا مجمع ہو گیا۔ بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دینے لگیں۔ میں ان سب کے درمیان بیجان بت کی طرح ساکت وصامت سر جھکائے زرد دوپٹے سے منہ لپیٹے بیٹھی تھی۔ وکیل اور گواہ آئے اور اذن طلب کرنے لگے۔ میں اقرار و انکار تو جب کرتی اگر میرا دل قابو میں ہوتا۔ وہ تو ایک طائر مذبوح کی طرح سینے میں لوٹ رہا تھا اور بجائے اقرار کرنے کے میں اس وقت دعا مانگ رہی تھی کہ میری حرکت قلب بند ہو جائے۔ اور یہ مشکل بڑی بیچی کے آنے سے آسان ہوئی۔

"یہ کیا ہڑبونگ مچا رکھی ہے، میری بچی کو تم سب نے پریشان کر دیا۔ وہ بھی کیا آجکل کی اور لڑکیوں کی طرح ہوائی دیدہ ہے۔ میری عذرا تو بڑی شرمیلی ہے جس دن سے گھر میں شادی کا ذکر ہوا۔ اس نے کمرے سے قدم نہیں نکالا۔ ہم نے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

تو مایوں اب بٹھایا ہے لیکن وہ تو دو مہینے سے خود مایوں بیٹھ گئی تھی۔ لو میں تمھارا اطمینان کئے دیتی ہوں" میرا سر ہلا کر چچی نے بڑے اطمینان سے کہا۔

اِس مضحکہ خیز رسمِ اقرار کے بعد وکیل وگواہ باہر گئے اور چاروں طرف سے مبارک سلامت کا شور مچگیا۔ مجھ کو میری سہیلیاں سنوارنے لگیں اور پورے دو گھنٹے کی محنت کے بعد مجھے انہوں نے ایک بیجان گڑیا کی طرح بنا سجا کر بٹھا دیا۔ میرا لباس عروسی بہت بیش قیمت اور بھاری تھا۔ دوپٹے میں موتیوں کا جال بنا ہوا تھا۔ اور آنچلوں پر آویزوں کی جھالر تھی۔ بھاری لباس اور بے انتہا زیور کے باعث میرا حرکت کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ جس کاؤچ پر میں بیٹھی تھی۔ اس کے گرد چار خواصیں میرا لباس درست کرنے کے لئے کھڑی تھیں۔ اور میری حالت اِس وقت ایک ایسے مفلوج کی مانند تھی۔ جس کے سننے سمجھنے اور حرکت کرنے کی طاقت زائل ہو چکی ہو۔

رونمائی کی رسم سے کچھ دیر قبل مجھے لٹا دیا گیا۔ تاکہ آرام لے لوں۔ جب سب لوگ میرے پاس سے ہٹ گئے۔ تو نرگس نے مجھے ایک لفافہ اور مخملی بکس دیا۔ کہ "میاں مجمی کا خانساماں لے کر آیا ہے۔ یہ کل شام کو اس نے لاکر مجھے دِیا تھا۔ لیکن آپ کے پاس بہت ہجوم تھا۔ اسلئے میں نہ دے سکی"

مَیں نے نرگس کو سب دروازے بند کرنے کی ہدایت کی اور پہلے بکس کھولا۔ اس میں ایک بیش بہا موتیوں کی مالا جگمگا رہی تھی۔ پھر خط کھولا۔ اس کا مضمون کم و بیش یہ تھا:۔

عذرا! پرسوں تمہاری شادی کا روز ہے۔ میں تم کو ازدواجی

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

زندگی میں داخل ہونے پر مبارکباد دیتا ہوں اور تمہاری صحت و سلامتی کے لئے دعا کرتا ہوں۔ مجھے تمہاری شادی کا بلاوا ملا تھا۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ تمہاری شادی میں شرکت کر سکوں۔ یقین ہے تم مجھے معاف کر دوگی میں بھی انسان ہوں اور ہر انسان کی طرح مجھے بھی اپنی کمزوریوں کا اعتراف ہے۔ لیکن تمہاری شادی کا تحفہ ارسال کر رہا ہوں۔ یقین ہے۔ ایک ناشاد انسان کا بھیجا ہوا تحفہ قبول کر کے اُسے مسرور کروگی۔ حالانکہ یہ تمہارے لائق تو نہیں ہے۔

میری ناکام زندگی تم سے جدا ہونے کے بعد بالکل ویران جنگل ہو کر رہ گئی ہے۔ میں تم کو اس سے قبل خط لکھنے کی ہمت کرتا رہا۔ لیکن نہ لکھ سکا۔ میں کل سے کلکتے کو چھوڑ رہا ہوں۔ تمہارے بغیر نام و نمود اور شہرت سب بیکار ہے۔ اپنی زندگی کو تمہاری یاد کے لئے وقف کر کے کسی تنہا جگہ میں جا کر رہوں گا۔

تم کو اپنی ازدواجی زندگی کی مسرتوں میں مصروف ہو کر مجھ کو بھول جانا چاہیئے۔ بوڑھے خانساماں کو میں ساتھ لے جانا نہیں چاہتا۔ اس لئے بھیج رہا ہوں۔ اسکی خدماتِ سابقہ اس لائق ہیں۔ کہ تم اس کو ہمیشہ اپنے پاس رکھو۔ ایامِ عروسی میں ایسی افسردہ تحریر پڑھنا یقیناً ناز یبا ہے۔ لیکن میں تم کو یہ اطلاع دینے کے لئے مجبور تھا عذرا۔ اسی لئے یہ خط لکھا ہے۔ اچھا ہمیشہ کے لئے خدا حافظ!"

تمہارا ناشاد نجمی"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اس خط کو پڑھ کر میرے خرمنِ عقل و حواس پر بجلی گر پڑی - اور میں ایک مدت ہوش و خرد سے بیگانہ رہی۔

جب میں ہوش میں آئی تو آفتاب کی کرنیں میرے رنگ کی طرح زرد تھیں اور میں اپنی خوابگاہ میں مسہری پر پڑی تھی۔ کمرے میں خس کے پردے پڑے ہوئے تھے اور برقی پنکھا چل رہا تھا۔

میں نے حیرت سے اپنے ارد گرد نظر ڈالی۔ سرہانے نرگس بیٹھی میرے چہرے کو محبت بھری متفکرانہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

" نرگس یہ گرمی کیسے ہو گئی ؟ کیا مہمانوں کی کثرت سے اتنی گرمی ہو گئی ہے ؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

نرگس مجھے ہوش میں پا کر خوش ہو کر بولی —— " اللہ تیرا شکر ہے میری بیگم اب تم ہوشیار ہو "

" کیسی باتیں کرتی ہے نرگس ! میں بے ہوش تھی کیا ؟" میں نے جلدی سے کہا۔

" آپ کے دشمنوں کی طبیعت پورے پانچ مہینے ناساز رہی ہے۔ آپکی شادی تو اوائل سرما میں ہوئی تھی - اور اب موسم گرما ہے " نرگس نے جواب دیا۔

" مجھے بالکل خبر نہیں ہے۔ میں تو ایسا محسوس کر رہی ہوں۔ کہ ابھی ابھی سوئی تھی اور اب جاگی ہوں، مجھے کیا ہو گیا تھا نرگس ؟" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"آپ نجمی میاں کا خط دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ میں نے آپ کی یہ حالت دیکھی تو خط اور بکس تو چھپا دیا۔ اور سب کو بلا یا۔ آپ بڑی مشکل سے ہوش میں آئیں تو آپ نے اپنے قیمتی لباس کو پارہ پارہ کر دیا۔ زیور توڑ ڈالا اور دیوانوں کی سی حرکتیں کرنے لگیں۔ سب مہمان افسوس کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اور وہی محل جو عشرت کدہ بنا ہوا تھا۔ آپ کی علالت سے غمکدہ بن گیا۔

مشہور مشہور ڈاکٹروں کے علاج کیے گئے۔ مگر آپ کو ذرا بھی افاقہ نہ ہوا۔ یا تو مدہوش پڑی رہتی تھیں۔ اور اگر ہوش میں آتیں۔ تو کبھی روتیں اور کبھی قہقہے لگاتیں۔ نجمی میاں کو بلاتیں اور ان کی تصویر سے باتیں کرتی تھیں۔ آج خدا کی مہربانی سے آپ کو خود ہی ہوش آگیا۔ ورنہ کیسے امید رہی تھی کہ آپ پھر بھی ہوش میں آسکیں گی۔"

"شدتِ غم سے میرا دماغ خراب ہو گیا۔" میں نے سرد آہ لیکر کہا۔

"میری بیگم خدا دشمن کا بھی ایسا نصیب نہ کرے جیسے آپ کا ہوا۔" نرگس ہمدردی کے لہجہ میں بولی۔

"تو جعفر وغیرہ کہاں ہیں؟" میں نے سوال کیا

"جعفر میاں پہلے تو آپ کی علالت سے بہت فکرمند تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ پہلے کی طرح رنگ رلیاں منانے لگے۔ اب دو مہینے سے تو وہ اور آپ کی پھوپھی جان حیدرآباد میں ہیں۔" نرگس نے جواب دیا

"اچھا ہوا جو وہ یہاں نہیں۔" میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"ایک اور بُری خبر بھی پچھلے ہفتے ملی ہے بیگم!" نرگس ٹھنڈا سانس لے کر بولی۔

"کیا نجمی کی بابت کوئی خبر ہے؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں ان کا تو کچھ پتہ ہی نہیں ملا۔ شہزادہ سکندر جاہ بہادر نے اخباروں میں بھی نکلوایا۔ اور ان کے سب دوستوں سے بھی معلوم کیا۔ خدا جانے وُہ کہاں ہیں"۔ نرگس نے افسوسناک لہجے میں جواب دیا۔

"پھر اور کون سی ایسی خبر ہے جو مجھے رنج پہنچا سکتی ہے۔ جلدی بتا نرگس!" میں نے کہا۔

"جعفر میاں نے دوسری شادی اپنے چچا کی لڑکی سے کر لی"۔ نرگس نے گھٹتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"خس کم جہاں پاک نرگس! یہ کون سی رنج کی بات ہے۔ میں تو یہ سن کر بہت خوش ہوئی"۔ میں نے ہنس کر کہا۔

نرگس میرے لئے پھلوں کا عرق لانے چلی گئی اور میں جعفر کو خط لکھنے لگی:-

"یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنی مسرت کا سامان کر لیا۔ مجھے اس میں ناراض ہونے یا آپ سے شکوہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہماری شادی محض بزرگوں کی خوشی کی خاطر اور چند ضروری وجوہ پر ہوئی تھی وہ مقصد اب حل ہو گیا۔

"اس شادی کی اہمیت گڈے گڑیا کے کھیل سے زیادہ نہیں ہے ہم کبھی ایک دوسرے سے اختلافِ تخیل کے باعث محبت نہیں کر سکتے۔ اس لئے ساتھ رہ کر زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ آپ نے دوسری شادی کر کے مجھے ان فرائض سے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

سبکدوش کر دیا جن کی اہم ذمہ داریوں کے خیال نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا لیکن اپنی خوشنودی کا سامان کر لینے کے بعد اب یقین ہے کہ مجھے بھی پابند کرنیکی آپ ضرورت نہ سمجھیں گے۔ میری ماٹی صحت اتنی نازک ہے۔ کہ شور و غل کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اسلئے آج میں یہ گھر چھوڑ رہی ہوں۔ کسی گوشے میں سکون کی زندگی بسر کروں گی۔ آپ میرے متعلق سوچنے اور مجھ سے ملنے کی کوشش کبھی نہ کیجئے۔ کیونکہ میں کبھی بھی آپ کے خیر مقدم کیلئے خود کو تیار نہ کر سکونگی اور ممکن ہے آپ کو دیکھ کر میری وحشت پھر عود کر آئے

"عذرا"

یہ خط ڈاک کے سپرد کر کے میں آپا ناہید سے جا کر ملی۔ مجھے ہوش و حواس میں پا کر وہ بہت مسرور ہوئیں اور مجھے گلے لگا کر روتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "عذرا! میں تمھاری قصوروار ہوں اس شادی کیلئے میں نے تم کو مجبور کیا جس کی وجہ سے تمھاری جان کے لالے پڑ گئے۔ مجھے کیا معلوم تھا پیاری بہن! کہ اس منحوس شادی کا یہ انجام ہوگا۔۔۔۔ طوطا چشم جعفر کیسا بے مروّت نکلا۔ تمھاری علالت کی اس نے ذرا بھی پروا نہیں کی اور جا کر دوسری شادی رچا لی۔ پھوپھی زہرا کا خون بھی سفید ہو گیا۔ اس بھتیجی کو جسے بڑے چاؤ چونچلوں سے بیاہا تھا۔ ایسا بیمار چھوڑ کر چلی گئیں"۔

"اب گزری ہوئی باتوں کا رنج فضول ہے ایسا ہوا ہی کرتا ہے آپا!" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

" والد کی وصیت کے متعلق میں نے تم سے بالکل غلط کہا تھا۔ دادی اماں

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کے مجبور کرنے سے والد خاموش ہو گئے تھے۔ لیکن جعفر کو وہ پسند نہ کرتے تھے۔ اور انہوں نے وصیت نامہ میں لکھا تھا کہ شادی کرنا نہ کرنا عذرا کی خوشی پر منحصر ہے۔ میں اس کو مجبور نہیں کروں گا۔ ہاں اگر عذرا جعفر سے شادی نہ کرے۔ تو نصف الاؤنس ڈھائی ہزار روپے ماہوار جعفر کو دیا جائے اور نصف عذرا کو۔ لیکن اس طرح خطاب شہزادگی اور خاندانی جواہرات جعفر کو نہ مل سکتے تھے اور پھوپھی جان اسی لئے گرویدہ ہو رہی تھیں۔ ان کی میٹھی باتوں میں آ کر میں نے تم سے جھوٹ بولا۔ اور آہ، تمھاری اور اپنی زندگی برباد کر دی"۔ انہوں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے اس کا پہلے ہی یقین نہ آتا تھا۔ کہ ابا جان میرے لئے یہ وصیت کر گئے ہونگے۔ خیر جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب رنج لاحاصل ہے۔ میں جا رہی ہوں" میں نے جواب دیا۔

"کیا حیدر آباد جانے کا ارادہ ہے؟" آپا نے جلدی سے سوال کیا۔

"حیدر آباد میں کیوں جانے لگی۔ وہاں میرا کون ہے؟ میں تو کسی گوشہ تنہائی میں زندگی بسر کرونگی۔ یہاں اب میرا دل نہیں لگتا۔ اس خونخوار جگہ میرے حسرت وارمان کی قربانی ہوئی ہے۔ مجھے یہاں سے خون کی بو آتی ہے اس لئے یہاں سے جا رہی ہوں"۔ میں نے جواب دیا۔

"آہ عذرا! ایسی مایوس کن گفتگو نہ کرو۔ مجھے تنہا چھوڑ کر کیوں جا رہی ہو اتنی سزا ابھی نہ دو"۔ آپا ناہید نے بے بسی کے انداز میں کہا۔

"تنہا ہوں آپ کے دشمن۔ سکندر بھائی ہیں، بچے ہیں، تچی ہیں۔"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ماشاء اللہ بھرا گھر ہے۔ جہاں آپ نے والد اور والدہ کو صبر کیا۔ وہاں مجھے بھی کر لیجئے۔ یہاں رہ کر میں پھر دیوانی ہو جاؤں گی آپا۔" میں نے جواب دیا "آہ تمہاری یہ حسین جوانی اور یہ افسردگی۔ بخدا میں اپنے اُس قصور سے کبھی بھی اپنے آپکو معاف نہ کر سکوں گی۔ جو پھوپھی کی باتوں میں آ کر میں نے کیا۔" ناہید آپا آنسو بہاتے ہوئے بولیں۔

" آپ رنجیدہ نہ ہوں اور گزشتہ باتوں کو بھول جائیں۔ مجھے دیکھئے اور صبر کیجئے۔ انسان قضا و قدر سے مجبور ہے۔ میری قسمت میں یہی لکھا تھا میں اپنی قسمت پر شاکر ہوں" میں نے مطمئن لہجے میں جواب دیا اور چلی آئی۔

دوسری صبح کو میں چند سادی ساڑھیاں اور مختصر سا ضروری سامان لیکر معہ نرگس اور نجمی کے خانساماں کے گھر سے رخصت ہو گئی۔ چلنے سے قبل میں اس جھیل پر گئی۔ جہاں کبھی میں اور نجمی بیٹھے تھے۔ گھر سے نکل کر میں نے ایک سال تک بلادِ اسلامیہ میں سیاحت کی اور پھر بمبئی آئی۔ یہ شہر کچھ مجھے دل سے پسند ہے۔ اپالو بندر کے جمگھٹے بہت اچھے لگتے ہیں اب یہاں سکون کیساتھ زندگی کے دن گزار رہی ہوں۔ لیکن ہر اُس دن اب بھی میری طبیعت بگڑ جاتی ہے جس تاریخ کو میرا نکاح ہوا تھا۔ کل میرے عقد کی تاریخ تھی اس لئے مجھ پر وحشت و جنون کا غلبہ تھا نسیمہ!"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

سفر کا مقصد

"ز۔ب"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ز۔ب

تعارف۔ محترمہ زیب صاحبہ۔ بیگم صاحبہ مسٹر اکبر علی تور اکسٹرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر آف ایگریکلچر ڈیرہ غازی خاں۔ مولوی سراج الدین احمد خانصاحب بانیٔ اخبار "زمیندار" کی دختر اور ملک کی مشہور شاعرہ محترمہ ر۔ح۔ب صاحبہ کی بہن ہیں۔ ہندوستان کے مقتدر شاعر جناب حامد علیخاں صاحب ایڈیٹر رسالہ ہمایوں آپ کے بھائی ہیں۔ ذوقِ ادب آپکو اپنے والدِ محترم اور والدہ محترمہ سے ترکے میں ملا۔ عربی فارسی اور اردو کی تعلیم گھر پر اپنی والدہ محترمہ سے حاصل کی۔ اور انگریزی زبان خود اپنی کوشش سے سیکھی۔

بچپن ہی سے آپ کو لکھنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ خاندان کے ننھے ننھے بچوں کے لیے اکثر آپ بہت دلچسپ کہانیاں لکھا کرتیں۔ جنھیں بچوں کو سنانے کے بعد اکثر تلف کر دیا جاتا۔

آپکا پہلا افسانہ "نیرنگِ فطرت" ہمایوں میں شائع ہوا اور اسی زمانے میں آپکی ادبی شہرت کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد بھی اکثر افسانے بعض اوقات آپ کے اپنے نام اور بعض اوقات فرضی ناموں سے شائع ہوتے رہے۔ اردو ادب میں آپکا درجہ بہت بلند ہے۔ آپکا شمار ہندوستان کی ان افسانہ نگار خواتین میں ہوتا ہے جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ آپکا افسانہ "وادی کا سوار" ہندوستان کے بہترین رومانوی افسانوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ریل گاڑی تیزی سے جا رہی تھی۔ دوسرے درجے کے ایک کمرے میں پانچ شخص سفر کر رہے تھے۔ دو مسافر جن میں ایک ذرا زیادہ باتونی اور اسی قدر جسیم و تخیم تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول تھے۔ ایک دُبلا پتلا نوجوان اخبار دیکھ رہا تھا۔ اور وقتاً فوقتاً ماتھے پر بل بھی ڈال لیتا تھا۔ ایک نوجوان مسافر کھڑکی میں سے سر نکالے دیر سے باہر جھانک رہا تھا اور کچھ سوچ کر بعض وقت خود بخود مسکرا بھی دیتا تھا۔

ایک صاحب جنہیں ضرورت سے زیادہ دوسروں کے حالات معلوم کرنے کی عادت تھی، نہایت بے تکلفی سے سب کے چہروں کا بغور معائنہ کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد خود بخود اپنے ساتھ والے باتونی کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "صاحب اب سگریٹ پر سے پھینک دیجئے بہت چھوٹا رہ گیا ہے۔ مبادا کہیں ...... ہیں .... پھینک دیا؟ خوب آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"بھوپال"!

"بخیریت؟"

"جی ہاں۔ وہاں میرے ایک عزیز ہیں مسٹر عبد الغنی بی۔اے۔ایل ایل بی۔وکیل۔اُن سے کچھ کام ہے۔"

"بہت بہتر!" (پھر ذرا بلند آواز میں) "حضرات! ہم پانچ مسافر اس درجے میں سفر کر رہے ہیں۔اِس وقت ہمیں ایک دوسرے سے جس قدر قرب حاصل ہے۔اسی قدر ہمارے سفر کے مقاصد متضاد ہوں گے۔اگر ہم میں سے کسی ایک کے لئے اِس سفر کا موضوع خوشگوار ہے۔تو کیا معلوم دوسرے کے لِئے اسی قدر ناگوار ہو!"

باتونی مسافر کا ساتھی۔"بالکل درست! لیکن صاحب میں ایک شادی میں شریک ہونے کے لِئے جا رہا ہوں۔"

"بہت خوب! میرے خیال میں سب صاحبوں کو اپنے اپنے سفر کی غرض وغایت بیان کرنی چاہیئے۔تاکہ ہم ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوسکیں۔قوم کی ترقی کا انحصار زیادہ تر باہمی اتحاد پر ہے۔اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے۔کہ ہم بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے پوست کندہ حالات سے واقف ہوجائیں۔"

باتونی۔"جی ہاں اور باتوں میں ذرا سفر بھی آسانی سے کٹتا ہے!"

وہی مسافر۔(اخبار پڑھنے والے نوجوان سے) "کیوں صاحب! کہاں کے ارادے ہیں؟"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"جہاں خدا لے جائے۔"

"لیکن آخر آپ کے سفر کا کوئی مقصد بھی تو ہو گا؟"

"کوئی خاص مقصد تو نہیں!"

"بس سیر و تفریح؟"

"تقریباً یہی سمجھ لیجیئے!"

نوجوان جو کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ اس کو مخاطب کر کے "کیوں صاحب! آپ کو انسانوں سے نفرت ہے جو سب سے منہ موڑ کر جنگل کی طرف اس دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔"

نوجوان۔ (سر اندر کی طرف پھیر کر) "حضرت گو میں باہر دیکھ رہا تھا لیکن آپکی سب باتیں بغور سن چکا ہوں۔ (مسکرا کر) اور مجھے معلوم ہو گیا۔ کہ رنج و راحت کا شریک بننے کے لیئے اب آپ میرے "پوست کندہ حالات" معلوم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ لیکن افسوس کہ فی الحال مجھے کوئی رنج نہیں البتہ اگر آپ صرف میری راحت میں شریک ہونا چاہیں۔ تو میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ میرے سفر کا موضوع خوشگوار ہی نہیں۔ بلکہ بڑی حد تک پُرلطف بھی ہے۔"

وہی صاحب۔ ٹھہریئے ٹھہریئے کہیں آپ مرزا امجد علی صاحب مرحوم کے صاحبزادے شمیم تو نہیں ہیں؟

نوجوان۔ آپ کا خیال درست ہے۔

وہی صاحب۔ "ارے شمیم تم مجھے پہچانتے نہیں۔ میں عبدالغفار ہوں۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

علی گڑھ میں میں نے تمھارے ساتھ انٹرنس کا امتحان دیا تھا۔
شمیم۔ (کچھ سوچ کر) "خوب آپ غفار ہیں لیکن اب آپ موٹے بہت ہو گئے ہیں تاہم آپکی آواز ابھی موٹی نہیں ہوئی کیونکہ مجھے گوش آشنا معلوم ہو رہی تھی۔"
عبد الغفار۔ "ارے بھائی تم بھی تو بالکل بدل چکے ہو۔ زمین و آسمان کا فرق ہے ہاں تو پلیٹ فارم پر میں نے تمھارے ہمراہ ایک شریف، پردہ نشین خاتون کو بھی دیکھا تھا۔ وہ کون تھیں تمھاری؟"
شمیم۔ وُہ خاکسار کی بیوی تھیں۔
عبد الغفار۔ کیا شادی ہو چکی ہے؟
شمیم۔ (مسکرا کر) جی ہاں!
عبد الغفار۔ کس خاندان میں؟
شمیم۔ میرے خسر خان بہادر مرزا الطاف علی کا نام تو آپ نے سنا ہوگا؟
عبد الغفار۔ اجی وہ تو میرے ہموطن ہیں — ارے دوست تم تو قسمت کے بہت یاور نکلے۔ کیا شادی بھی کر چکے ہو؟
شمیم۔ پہلے اپنے ہوش و حواس درست ہو لینے دیجئے پھر باتیں کرینگے۔
عبد الغفار۔ نہیں بھائی میرا خیال دوسری طرف تھا لیکن بھئی تم نے کمال کر دیا۔
شمیم (ہنستے ہوئے) تو جناب کیا میرا زوال چاہتے تھے؟
عبد الغفار۔ خدا نہ کرے۔ اچھا بھئی وہ تم نے کیا کہا تھا کہ "میرے سفر کا موضوع خوشگوار ہی نہیں بلکہ پُر لطف بھی ہے۔"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

شمیم - یہ ایک طویل داستان ہے۔

عبدالغفار - اور ہمیں اس سے محروم رکھنے کی وجہ ؟

شمیم - کوئی نہیں، میں تو کسی زندہ دِل فردِ بشر کو یہ افسانہ سننے سے محروم رکھنا نہیں چاہتا۔ صاحب اس کی "عملی تصنیف" کے لئے میں نے سخت محنت اور جانفشانی کی ہے - اور اب اس کی تشریح کرنا میرے لئے کچھ دشوار نہیں بلکہ مسرت خیز ہے۔

پہلے بالتونی صاحب - (جو اپنے ایک ساتھی سے لگاتار باتیں کرنے کے باوجود شمیم کی تمام باتیں بھی سن رہے تھے) لیکن صاحب افسانے سے لطف اندوز ہونے کی حقدار تو تمام پبلک ہوتی ہے۔

شمیم - آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے۔ میں آپکی تائید کرتا ہوں۔

بالتونی صاحب کا ساتھی - پھر تو ہمیں بھی اپنی نشست چھوڑنا پڑی۔

شمیم - اس قصہ کا ہیرو چونکہ خود میں ہوں۔ اسلیئے اپنے متعلق چند ابتدائی حالات سے آپ کو واقف کر دینا ضروری ہے۔ میرے والد مرزا امجد علی صاحب مرحوم تعلقدار میرے لڑکپن ہی میں انتقال فرما گئے تھے اور اپنی والدہ مرحومہ کی تو میں صورت سے بھی نا آشنا ہوں۔ میں اکلوتا بیٹا تھا۔ والد مرحوم نے میرے لئے اسقدر جاگیر اور نقد ترکے میں چھوڑا۔ کہ آجتک بفضل خدا مجھے کبھی روزگار کے لئے پریشان نہیں ہونا پڑا۔ ان کی وصیت کے مطابق میں نے تعلیم پائی اور ایم اے کر لینے کے بعد سوائے اپنی جائداد کا معمولی انتظام کرنے کے مجھ پر کوئی خاص بار نہیں پڑا۔ بیکاری

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کی گھڑیوں کو پُرلطف بنانے کیلئے میں نے اور میرے ہی جیسے چند بے فکر دوستوں نے ایک انجمن قائم کرلی جس کے ہر رکن کا فرض تھا کہ وہ کوئی ایسا انوکھا مذاق کرے جسکی نظیر مشکل ہو۔ بعض وقت پبلک کی مُردہ دلی اور حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی کو روکنے کے خیال سے عام لوگوں کو مفت مذاقیہ ڈراموں سے محظوظ کیا جاتا۔

ہماری انجمن کو اگر کسی چیز سے دشمنی تھی تو وُہ صرف رنج والم تھا۔ اگر کبھی کوئی رکن کسی وجہ سے ملول ہو جائے تو اُسے فوراً انجمن سے نکال دینے کی دھمکی دیجاتی۔ اداسی ومی ہماری انجمن میں بمنزلہ ایک زہر بلے جرثومے کے سمجھا جاتا تھا جو غم کی لاگ سے مسرت کو تباہ کر دینے والا ہو۔ ہر رکن کو نئے نئے مذاق کرنے کے لئے بعض وقت سخت کوفت اٹھانا پڑتی لیکن جب شام کے وقت سب ارکان میرے ایک بنگلے پر (جو خاص اسی لئے مخصوص تھا) جمع ہو کر اپنے اپنے کارہائے نمایاں بیان کرتے تو یہ پُرلطف گھڑیاں ساری کوفت بھلا دیتیں اسی طرح ایک شام (اب اخبار پڑھنے والے مسافر کی دلچسپی بھی اخبار سے کم ہونے لگی اُس نے ایک نظر پھیر کر شمیم کو دیکھا۔ پھر بظاہر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا) ہم سب جمع تھے اور ایک دلچسپ واقعے پر تنقید ہو رہی تھی جو اسی روز پیش آچکا تھا۔ میرے عزیز دوستوں میں سے ایک نے لمبی داڑھی لگا کر اور سبز چوغہ پہن کر جمعہ کی نماز کے بعد مسجد میں وعظ کیا تھا۔ آپ نے وعظ کے دوران میں قوم کے یتیم و بیکس بچوں اور بیواؤں کی وہ حالت زار بیان کی کہ تمام بھولے بھالے سامعین پر رقت طاری ہو گئی۔ خود حضرت کی ریش مبارک بھی آنسوؤں سے تر تھی۔ اس کے بعد دھڑا دھڑ چندہ جمع ہونا شروع ہوا بعض فاقہ مست اصحاب نے تو جیبیں

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ہی خالی کر دیں۔ میرا یہ دوست پہلے ہی اس شام اپنے دوستوں کو ایک پُر تکلف دعوت کے لئے مدعو کر چکا تھا لیکن کسی کو ہرگز یہ معلوم نہ تھا کہ دعوت کے واسطے روپیہ فراہم کرنے کے لئے یہ صورتِ عمل اختیار کی جائے گی۔ میں اُس روز کسی وجہ سے دعوت میں شریک نہ ہو سکا۔ لیکن میرے دوسرے عزیز دوست نے بھی بلا وجہ دعوت میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ اور جب میزبان صاحب اپنے دوستوں کے ہمراہ ایک ہوٹل میں بیٹھے قسم قسم کے نفیس کھانے تناول فرما رہے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ گزرے ہوئے قصے کو نمک مرچ لگا لگا کر بیان کئے جا رہے تھے تو میرا وہ دوست پولیس افسر کا بھیس بدل کر کچھ اپنے ہی جیسے سپاہیوں کے ہمراہ ان کے سر پر پہنچ گیا۔ سب سے پہلے ہتھکڑی میزبان کو لگ گئی۔ اور مہمان بھی زیرِ حراست لے لئے گئے۔ اس کے بعد مصنوعی پولیس افسر صاحب اور ان کے سپاہیوں نے ڈٹ کر وہ دعوت اڑائی۔ اور بعد میں ایک قہقہہ لگا کر تمام بھرم کھول دیا۔

مجھے جب یہ واقعہ معلوم ہوا۔ تو اس میں اپنے شریک نہ ہو سکنے کا بہت افسوس کیا۔ لیکن اُسی وقت میں نے عہد کر لیا۔ کہ اب ایک اس سے بھی بڑھ کر پُر لطف ڈراما کیا جائے۔ اس کا پلاٹ میں مدت سے سوچ رہا تھا اور اسکی ابتدا دوسرے ہی دن ہو گئی۔

احباب میں اکثر میری شادی کے متعلق چرچا ہوتا رہا۔ لیکن میں ہمیشہ یہی جواب دیتا۔ کہ ہندوستان کا موجودہ طریق ازدواج مجھے پسند نہیں جب شادی کا مفہوم ہی خوشی ہے۔ تو کیوں نہ اُس کے لئے کوئی ایسا طریق عمل

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اختیار کیا جائے۔ جس سے وہ حقیقی معنوں میں شادی کہلا سکے۔

خان بہادر مرزا الطاف علی صاحب میرے والدِ مرحوم کے آشناؤں میں سے تھے۔ اس وقت تک مجھے خود ان سے کبھی شرفِ نیاز حاصل نہ ہؤا تھا۔ تاہم میں اس قدر جانتا تھا کہ وہ ایک زندہ دل، روشن خیال، نیک خو بزرگ ہیں اور والد کی دلی خواہش تھی کہ میرا رشتہ انہیں کے گھرانے میں کیا جائے لیکن موت نے انہیں مہلت نہ دی۔

میں نے چند خاص دوستوں کو اپنا ہمراز بنا کر اپنی جائداد وغیرہ کا انتظام ان کے سپرد کیا۔ اور انہیں اپنا آئندہ نظامِ عمل اچھی طرح سمجھا کر کہدیا کہ میری غیر حاضری کی کوئی خاص وجہ مشہور نہ ہو۔ مجھے کسی لمبے چوڑے سامانِ سفر کی ضرورت نہ تھی۔ اپنے دوستوں سے رخصت ہو کر میں دوسرے دِن خان بہادر مرزا الطاف علی (اپنے خسر) کی خدمت میں جا حاضر ہؤا لیکن حضرات سنیئے۔ اُس وقت میں اس حالت میں نہ تھا کہ جو آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں۔ میرے کپڑے پھٹے ہوئے اور غلیظ تھے۔ میرے پاؤں ننگے تھے۔ میرے منہ پر اور بالوں میں خدا جھوٹ نہ بلوائے، منوں مٹی اور گرد جمی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے مرزا صاحب کے نوکروں نے میری تواضع کی۔ کسی نے فقیر سمجھ کر گالیاں دیں۔ کسی نے ایک چپت رسید کیا۔ لیکن ہم کہاں ٹلنے والے تھے۔

(اب اخبار پڑھنے والا مسافر بھی اپنی جگہ چھوڑ کر قریب کی ایک نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔ ماتھے پر اب کوئی بل نہ تھا۔ بلکہ چہرے پر مسکراہٹ نمودار تھی)

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اتنے میں مرزا صاحب کی سب سے چھوٹی صاحبزادی جس کی عمر تقریباً پانچ یا چھ سال کی تھی اُدھر آنکلی۔ مجھے نوکروں کے ہاتھوں عاجز آئے ہوئے دیکھ کر دوڑتی ہوئی مرزا صاحب کے پاس گئی اور میری حالتِ زار کا نقشہ ان کے سامنے پوری طرح کھینچکر رکھدیا۔ مرزا صاحب کا ایک نوکر ایک بڑا سا کُتّا جو کچھ دُور بندھا ہوا تھا مجھ پر چھوڑنے کے لیئے کھول ہی رہا تھا۔ کہ وُہ بچّی کا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر تشریف لائے۔ نوکروں کو خوب ڈانٹا۔ پھر جیب سے ایک دوّنی نکال کر میری طرف مخاطب ہوئے۔"لو میاں اِس دروازے سے بھاگ جاؤ۔"

مَیں نے ذرا کھنکار کر کہا۔"سرکار میں فقیر نہیں ہوں"۔

مرزا صاحب کا ہاتھ وہیں رُک گیا۔ پھر میرے چہرے پر ایک گہری نگاہ ڈال کر بولے۔"کہاں سے آئے ہو؟" مَیں نے جواب دیا۔" سرکار مجھے نوکری کی تلاش ہے۔ حضور کی بڑی تعریف سُنی تھی کہ آپ غریبوں کی دستگیری فرماتے ہیں۔"

مرزا صاحب۔ ہمیں تو فی الحال شاید کسی نوکر کی ضرورت نہیں"۔

مَیں۔ تو جناب پھر میں کہاں جاؤں؟

مرزا صاحب۔ (کچھ سوچ کر) اچھا ٹھہرو۔ تم کیا کام کر سکتے ہو؟

مَیں۔ جناب خدا نے ہاتھ پاؤں دیئے ہوں تو انسان جو کام چاہے کر سکتا ہے۔

مرزا صاحب۔ اچھا اندر کے کام کے لیئے ایک آدمی کی ضرورت ہے۔ ماما کو برتن صاف کر دیا کرو گے۔ اور بیگمات جو کام بتائیں مثلاً بازار سے کوئی سودا وغیرہ منگانا ہو تو ......

مَیں۔ بہت بہتر سرکار! برتن صاف کرنا تو میرا کام ہی ہے۔ اَور بازار سے سودا خرید نا بھی میں خوب جانتا ہوں۔

مرزا صاحب۔ کیا تنخواہ لوگے؟

میں۔ جو حضور عنایت فرمائیں۔

مرزا صاحب۔ فی الحال چھ روپے اَور کھانا تمھیں منظور ہے؟

میں۔ سرکار میرے لیئے یہ بھی زیادہ ہیں۔

مرزا صاحب۔ (ہنسکر) زیادہ ہیں؟

میں۔ جی ہاں۔ پہلے جہاں ملازم تھا۔ وُہ صرف پانچ ہی روپے دیا کرتے تھے

مرزا صاحب۔ تمہارا نام کیا ہے؟

میں۔ جو کچھ حضور تجویز فرمائیں

مرزا صاحب۔ خوب نام تو تمھارے ماں باپ نے رکھا ہوگا۔ یا آج ہم تجویز کریں۔

میں۔ سرکار، میرے ماں باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ اب جو کسی کا جی چاہے اسی نام سے پکار لیتا ہے۔

مرزا صاحب۔ آج کل لوگ تمھیں کس نام سے پکارتے ہیں

میں۔ جناب مجھے شمّو کہتے ہیں۔

مرزا صاحب۔ شمّو، اصل نام کیا ہے شمس الدین؟

میں۔ جی نام تو کئی بن جاتے ہیں شمس الدین بھی شمیم بھی۔

مرزا صاحب۔ تمھیں کون سا نام پسند ہے؟

میں۔ سرکار، سچ پوچھیں تو شمّو شمیم ہی سے بگڑ کر بنا ہے۔ لیکن پہلے صاحب کا

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

نام خود بھی شمیم تھا۔ اس لئے انہوں نے مجھے ایک دن دوسروں کے سامنے اپنا پورا نام ظاہر کرنے پر خوب زد و کوب کیا۔ اُس روز سے اپنا نام بتاتے ہوئے ڈرتا ہوں۔

مرزا صاحب نے ایک قہقہہ لگایا۔ "اچھا یہ بات ہے۔ غالباً اسی وجہ سے انہوں نے تمہیں نکال بھی دیا۔"

میں۔ جی نہیں میں خود ہی چلا آیا۔

مرزا صاحب۔ تمہارے ماں باپ کون تھے؟

میں۔ حضور میں نے انہیں دیکھا نہیں۔

مرزا صاحب۔ سنا تو ہوگا۔

میں۔ جناب سنا ہے کہ وہ ذات کے مغل تھے اور بڑے شریف تھے۔

مرزا صاحب۔ خوب! مغل تو ہم بھی ہیں۔

میں۔ تو جناب پھر وہ کچھ اور ہوں گے۔ مجھے اچھی طرح معلوم نہیں۔

مرزا صاحب۔ نہیں نہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ بجز ہمارے اور کوئی مغل ہو ہی نہیں سکتا۔ قسمت کے پھیر ہیں۔ تم شکل و صورت سے ایک شریف آدمی معلوم ہوتے ہو۔ لیکن فلاکت نے تمہارا حال ابتر بنا رکھا ہے۔ چلو اندر بیگم صاحبہ کے پاس۔ دراصل تم انہیں کے ملازم ہو۔ انہیں اپنی ضرورت کی چیزیں منگوانے کے لئے ایک آدمی کی ضرورت ہے۔

میں نے بہت بہتر کہا اور مرزا صاحب کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ مرزا صاحب کی اہلیہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھیں، انہیں آتے دیکھ کر بیٹھ گئیں۔ میں آداب

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

بجا لایا۔ وہ میری طرف دیکھ کر ذرا حیران ہوئیں۔ لیکن جلد ہی مرزا صاحب نے انہیں سارا واقعہ کہہ سنایا۔ اب وہ خوش معلوم ہوتی تھیں۔ میری طرف مخاطب ہو کر بولیں "اُوئی تمہارا کیسا موئے بھک منگوں کا سا حال بنا ہے۔ جاؤ تو ذرا اپنے کپڑے بدل آؤ"۔

مَیں نے ٹھنڈی سانس بھر کر نگاہ نیچی کر لی۔ اور خاموش رہا۔

مرزا صاحب نے کہا۔ "اسے میرے دھلے ہوئے کپڑوں میں سے پہننے کیلئے کپڑے دیدو۔" میری باچھیں کھل گئیں۔ چہرے سے یوں ظاہر کیا جیسے کبھی دُھلے ہوئے کپڑوں کی شکل بھی نہ دیکھی ہو۔ بیگم صاحبہ نے بڑی محنت سے مرزا صاحب کے سب کپڑوں میں سے ڈھونڈ کر جو کپڑے ناکارہ تھے نکال کر مجھے لا دیئے۔ میں نے سلام کر کے لے لئے۔ اور نہانے کے لئے کسی مسجد کی تلاش میں نکل گیا۔ مجھے دو تین گھنٹے باہر ہی لگ گئے۔ کیونکہ تمام واقعات حسب وعدہ اپنے دوستوں کی ضیافتِ طبع کے لئے انکو لکھ کر بھیجنے تھے۔

جب میں گھر آیا۔ تو بیگم صاحبہ مع اپنی تینوں صاحبزادیوں کے چائے پی رہی تھیں۔ مرزا صاحب کی بڑی لڑکی خورشید کی شادی ہو چکی تھی لیکن ان کے شوہر ابھی ولایت میں بیرسٹری کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اسلئے وہ بھی اکثر یہیں رہتی تھیں۔ منجھلی قمر جو اس وقت میرے سامنے منتظر رہی ہیں ناکتخدا تھیں۔ اور تیسری ابھی بچی ہی تھی۔ سب سے بڑا لڑکا ایم۔ اے میں تعلیم پا رہا تھا۔ اور دوسرا ابھی انٹرنس کی تیاری میں مصروف تھا۔ بڑی صاحبزادی کے دو خرد سال بچے بھی تھے۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

مَیں بیگم صاحبہ اَور اُن کی صاحبزادیوں کے سامنے آداب بجا لایا۔ بیگم صاحبہ میرے دیر لگا کر آنے سے سخت برہم ہو گئیں تھیں، اتنے میں مرزا صاحب بھی باہر سے آ گئے اَور بولے۔ "بیگم! میں نہ کہتا تھا کہ وُہ بڑا سیدھا سادہ شریف لڑکا ہے۔ دھوکا نہیں کریگا۔ آخر آ ہی گیا۔

بیگم صاحبہ نے آہستہ آہستہ منہ میں کچھ کہا اور پھر میری طرف مخاطب ہوئیں۔ "کیا نام شمّو! سن لے آج تجھے معاف کرتی ہوں۔ اس کے بعد پھر کبھی تو نے اِس طرح باہر دیر کی تو نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "بیگم صاحبہ مسجد ہی کوئی نہیں ملتی تھی تلاش کرنے کرتے دیر ہو گئی۔" بڑی لڑکی بولی۔ "اماں ابھی یہ نیا نیا ہمارے شہر میں آ رہا ہے۔ ابھی اِسے یہاں کوئی ایسی واقفیت تو ہو گی نہیں۔"

قمر بولی۔ "بعض وقت آدمی سے بھول بھی ہو جاتی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد بیگم صاحبہ پھر خوش ہو گئیں۔ مرزا صاحب مجھے مخاطب کر کے بولے۔ "شمّو! اب تم صاحب بہادر معلوم ہوتے ہو۔"

مَیں مسکرانے لگا۔

مرزا صاحب: لیکن منہ دھونا تمہیں ابھی تک نہیں آیا۔ دیکھو ابھی تک منہ پر مٹی لگی ہے۔

مَیں۔ "سرکار آہستہ آہستہ سب کچھ سیکھ جاؤنگا۔" اس پر تینوں خاتونیں ہنس پڑیں۔

اب میری زندگی ایک عجیب پُرلطف طریقے سے بسر ہونے لگی۔ سارا دن ماما مجھ سے برتن وغیرہ صاف کراتی اور ساتھ ہی ساتھ اپنا رعب جتانے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کے لئے خوب ڈانٹ بنا یا کرتی۔ جو ذلیل اور ادنی کام ہوتا۔ نوکر غریب اور بیوطن جان کر مجھی سے کراتے۔ ادھر میں باہر نکلتا تو نوکروں کے سامنے اور بھی بیوقوف اور بھولا بھالا بن جاتا۔ ماما کی ڈانٹ اس طرح برداشت کرتا۔ جیسے وہی میری اصل مالکہ ہے۔ پھر آہستہ آہستہ میں نے بیگم صاحبہ کے دل میں خوب شفقت کی جگہ لے لی۔ پہلے ہی دن جب نمونے کے طور پر انہوں نے مجھ سے کچھ کپڑا منگایا۔ تو میں نے اپنی گرہ سے زیادہ قیمت دے کر اُن سے بہت کم دام لئے۔ اس پر وہ بیحد خوش ہوئیں اور اُس روز تمام نوکروں کو خوب ڈانٹ بتائی۔ کہ تم سب بے ایمان ہو۔ میں نے جب یہ دیکھا۔ تو چند دن بعد پھر ایک خوبصورت سا برتن تین روپے میں بازار سے خرید لایا۔ بیگم صاحبہ کو اسکی ضرورت تھی۔ بیگم صاحبہ دیکھ کر خوش ہوگئیں اور بولیں۔ "ارے شمو! یہ کہاں سے ملا؟" میں نے کہا سرکار! بازار سے لا رہا ہوں"۔

بیگم صاحبہ۔ "کیا قیمت ہے اسکی؟"

میں۔ "سرکار دو روپے"

بیگم صاحبہ۔ " اُوئی توبہ یہ ماما مُردار ابھی آٹھ دن نہیں ہوئے۔ اسکی قیمت تین روپے بتا رہی تھی۔ جا تو اس کو ساتھ لے جا اور اس کے سامنے ایک اور ایسا برتن خرید کر لے آ۔"

میں ذرا پریشان ہوا۔ لیکن جلد ہی بولا۔ "سرکار دوکاندار دکان بند کر کے ابھی ابھی کہیں چلا گیا تھا"۔ بیگم صاحبہ نے ماما کو بلا کر خوب ملامت کی۔ کہ تو ہمیں دھوکا دے کر ایک روپیہ ہضم کرنا چاہتی تھی۔" ماما مجھ پر دانت پیس کر بڑبڑاتی

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ہوئی واپس چلی آئی۔ "جانے مونڈی کاٹا کس کا گھر لوٹ کر لے آتا ہے۔"

جب مرزا صاحب نے دیکھا کہ میں اُن کے سُوٹ سلیقے سے تہ کرتا اور سنبھالتا ہوں تو وُہ اپنا کام مجھ سے نہایت شوق سے کرانے لگے۔ ماما کو منع کر دیا کہ مجھ سے برتن نہ صاف کرایا کرے۔ لیکن وُہ کب منع ہوتی تھی۔ میں بھی جب موقع ملتا۔ اُسے بلاچون وچرا برتن صاف کر دیتا۔ اب گھر کے بچے بچے کو مجھ سے دلچسپی ہو گئی۔ بچے کہتے تھے کہ شمّو کے ساتھ ہی سیر کو جائیں گے۔ بیگم صاحبہ کہتیں، بس میں اپنے کام سوائے شمّو کے کسی سے نہ کراؤں گی سب نوکر بدتمیز اور بے ایمان ہیں۔ مرزا صاحب چاہتے تھے کہ شمّو صرف میری خدمت میں رہے۔ دونوں لڑکیاں چاہتی تھیں کہ شمّو اپنے گزشتہ (من گھڑت) واقعات ہی بیان کرتا رہے۔ کیونکہ مجھے باتوں کو مذاق کے پیرائے میں بیان کر لینے پر خاص قدرت حاصل تھی۔ میں بھی حتی المقدور ہر شخص کو خوش رکھنے میں کسر نہ اُٹھا رکھتا۔ کیونکہ ہماری انجمن میں ہر قسم کی محنت برداشت کر لینا ہی سب سے بڑی فضیلت قرار دی گئی تھی۔

ایک دن میں باورچی خانے میں بیٹھا برتن صاف کرنے میں مشغول تھا کہ اتنے میں وہاں قمر آ گئیں، میرے میلے کچیلے کپڑے دیکھ کر کہا۔ "شمیم اگر کوئی شخص تمہاری باتیں سُنے تو کہے کہ تم ایک گریجو ایٹ سے کسی طرح کم نہیں۔ لیکن اگر تمہارے کپڑوں کو دیکھے تو کبھی تمہارے ہاتھ کے صاف کئے ہوئے برتنوں میں کھانا بھی کھانا گوارا نہ کرے۔" میں نے کہا۔ "بی بی باتیں کرنا تو میرے اختیار میں ہے۔ اگر کپڑے پہننے بھی اسی طرح اختیار میں ہوتے تو آپ دیکھتیں کہ میں کیسے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اچھے کپڑے پہنتا۔" قمر نے سادگی سے کہا۔ "کپڑے نہیں ہیں تو ابا سے لیکر پہن لو۔"
اس کے بعد وہ چلی گئیں۔ مجھے ایک شرارت سوجھی۔ دوستوں نے ایک خراب اور پرانے ٹرنک میں ایک دو سوٹ رکھ کر ضرورت کے وقت پہننے کے لیے میرے پاس بھجوا دیئے تھے۔ اپنی کوٹھڑی میں چپکے سے جا کر میں نے ایک سوٹ نکالا (جو بالکل مرزا صاحب کے ایک سوٹ سے مشابہ تھا) اور پہن لیا۔ کالر ٹائی وغیرہ درست کر کے پھر اپنی جگہ پر آ کر برتن صاف کرنے لگا۔ اتنے میں ماما باہر سے آگئی۔ میری اُدھر پشت تھی۔ اُسے شاید مرزا صاحب کا دھوکہ ہو گیا۔ بے اختیار اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اُسکی آواز سن کر قمر، ان کی بڑی بہن اور بیگم صاحبہ بھی آ گئیں۔ پہلے تو سب حیران ہوئے۔ لیکن جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو سب کا مارے ہنسی کے بُرا حال تھا۔ قمر نے ساری بات جو پہلے ہو چکی تھی بیگم صاحبہ کو سنائی۔ کچھ دیر میری اس قطع وضع اور برتن مانجنے پر ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ اس کے بعد بیگم صاحبہ کو سوٹ کا خیال آیا۔ بولیں:۔
"بدبخت! مرزا صاحب اپنے سوٹ کا یہ انجام دیکھیں تو تمہیں کاٹ ہی ڈالیں جا ان کے آنے سے پہلے پہلے اُتار کر رکھدے۔" میں نہایت فرمانبرداری سے اُٹھا۔ اور سوٹ اُتار کر پھر اپنے صندوق میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ بعد میں میں نے دونوں لڑکیوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا۔ خورشید بولیں۔ "توبہ یہ شمو کیسا شریر نکلا۔ ابا جان کو کپڑے پہنتے دیکھ کر کیسے اس نے بالکل اسی طرح پہن لئے جیسے مُردار کا لباس ہی یہی ہے۔"
قمر۔ خیر ابا کو پہنتے تو سبھی نوکر دیکھتے ہیں۔ میرے خیال میں تو یہ غیر معمولی طور

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

پر ذہین ہے۔ اگر بچپن میں اس کے ماں باپ مر نہ جاتے۔ جو واقعی کوئی شریف لوگ ہونگے۔ تو ضرور یہ بیچارہ بہت ترقی کرتا۔"

خورشید۔ اس کا حوصلہ تو دیکھو۔ ہم سے ڈرا بھی نہیں۔ کہ ابا جان کے کپڑے اُسے پہنے ہوئے دیکھ کر ہم خفا ہونگے۔"

قمر۔ دانا ہے نا۔ وہ ہمارے مزاج کو خوب سمجھ گیا ہے۔ کہ کس بات پر ہم ناراض ہوتے ہیں اور کس پر خوش۔ میرے خیال میں حد سے زیادہ خوف کھانا بھی احمقوں کا کام ہے۔ دوسرے اباجان بھی تو اُس پر خاص شفقت کی نظر رکھتے ہیں۔ انہیں تو خاص طور پر زندہ دل آدمی ہی پسند ہیں اسلئے جبھی تو آپا مجھ سے ناراض ہوا کرتے ہیں کہ تم بہت جلے دل والی ہو اور خورشید اچھی ہے جو ہنس مکھ تو ہے۔

خورشید۔ لیکن ایک بات یہ بدبخت کسی طرح نہیں سمجھتا کہ ہمیں گندے کپڑوں سے نفرت ہے۔ اباجی بھی بہت چاہتے ہیں کہ صاف رہا کرے۔

قمر۔ ہاں اس پر مجھے بھی تعجب ہے۔

چند روز بعد ایک اور اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ مرزا صاحب کے ہاں کوئی اجنبی مہمان ان سے ملنے کے لئے آئے۔ مجھے تاکید ہوئی کہ تمہارے سوائے کوئی شخص چائے لے کر نہ آئے۔ اور مرزا صاحب نے یہ بھی کہا کہ "ذرا اچھے کپڑے پہن کر چائے لانا۔" اب ماما تو چائے تیار کرنے لگی۔ اور میں نے صابن لے کر اچھی طرح منہ ہاتھ اور پاؤں وغیرہ دھوئے۔ اور اُس سے کہا۔ کہ چائے کشتی میں رکھ کر میری کوٹھڑی کے سامنے رکھدے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

میں کپڑے پہن کر لیجاؤں گا۔ اِدھر میں نے پھر اپنا وہی سوٹ اور مرزا صاحب کا ایک بوٹ پہنا۔ چائے کی کشتی اُٹھائی اور اُس کمرے میں داخل ہوا۔ جہاں مرزا صاحب تھے۔ مہمان نے جب ایک شخص کو چائے کی کشتی اُٹھا کر آتے ہوئے دیکھا۔ تو ہچکچا سے گئے۔ مجھ سے کشتی پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے مجبوراً مصافحہ کیا۔ وہ ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ "تشریف رکھیئے" میں بیٹھ تو گیا مگر مرزا صاحب کے سامنے آنکھ نہ اٹھا سکتا تھا۔ وہ بار بار مہمان سے نظر بچا کر مجھ پر قہر آلود نگاہیں ڈالتے۔ لیکن میں نے بدستور نگاہ نیچی رکھی۔ مہمان نے بتواضع چائے کی پیالی میرے آگے بڑھا دی اور مجبوراً مجھے پینا پڑی۔ مرزا صاحب کے غیظ و غضب کا بھی مجھے اندازہ تھا اور میں دل ہی دل میں لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مہمان نے چائے پیتے ہوئے مجھ پر ایک شفقت کی نگاہ ڈالی؛ اور مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔ "صاحبزادے کہاں تعلیم پاتے ہیں؟" مرزا صاحب نے سُنی اَن سُنی ایک کر کے کوئی اور ذکر چھیڑ دیا۔ بزرگ مہمان کی شفقت برابر مجھ پر جاری تھی۔ کبھی بسکٹ میری طرف بڑھاتے اور کبھی کیک کھانے کے لئے کہتے ہیں نہایت متانت سے سب کچھ کھائے جاتا۔ مرزا صاحب کو مجھ پر اس وجہ سے اور بھی غصہ آتا۔ کہ ان کے معزز مہمان مجھے اُن کا بیٹا سمجھ رہے تھے۔ اور میں پہلے تو چائے خود اٹھا کر لایا تھا۔ اب اُلو کی طرح بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ مہمان کے ہر سوال کا جواب میں نہایت شرمیلے انداز میں ٹھہر ٹھہر دیتا تھا۔ مرزا صاحب کو مارے گھبراہٹ اور

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

غصّے کے بات کرنی دشوار ہو رہی تھی۔ ایک مرتبہ تو اُنہوں نے مہمان کی کسی بات کا ایسا الٹا جواب دیا۔ کہ بے اختیار مجھے ہنسی آ گئی۔ جوں توں کر کے چائے ختم ہوئی۔ میں فوراً اُٹھا اَور سب چیزیں سمیٹ سلام کر کے دروازے تک آیا۔ ایک لمحے کے لئے مَیں رُکا۔ اَور پھر دہلیز میں بیٹھ کر کیک کے بچے کھچے ٹکڑے کھانے شروع کئے۔ اب مرزا صاحب کا غصہ آخری درجے تک پہنچ چکا تھا مجھ پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی اَور بے اختیار اُنکے منہ سے کوئی سخت کلمہ نکل گیا۔

مہمان (یہ سمجھکر کہ مرزا صاحب نے ان سے کوئی بات کی ہے) کیا ارشاد فرمایا جناب نے"؟

اب مجھ میں مرزا صاحب کا جواب سننے کی تاب نہ رہی۔ فوراً گٹھڑی اٹھائی اَور باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد غالباً مہمان تو رخصت ہُوا اور مرزا صاحب اندر آئے۔ ہَیں کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے اب چائے کے برتن صاف کر رہا تھا۔ مرزا صاحب نے آتے ہی نہایت پر غضب لہجے میں مجھے آواز دی۔ "او شمّو!"

میں جلدی سے ہاتھ دھو کر سامنے جا کھڑا ہُوا۔ مرزا صاحب نے قمچی لیکر تڑاتڑ مجھ پر برسانی شروع کیں۔ ساتھ ساتھ کہتے تھے۔ "ملعون! گستاخ اب تو حد سے بڑھ چلا ہے۔ آج تو نے ایک معزز شخص کے سامنے مجھے بہت خفیف کیا۔ چل یہاں سے دُور ہو۔ نکل جا اَور آئندہ کبھی اِدھر کا رخ نہ کرنا۔"

میں مرزا صاحب کے پاؤں پر گر گیا۔ اَور کہا۔ "سرکار آج کی خطا معاف کر دیجئے۔" انہوں نے مجھے بوٹ کی ٹھوکر سے پرے دھکیل دیا۔ اتنے میں

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

بیگم صاحبہ بھی آگئیں۔ مرزا صاحب نے مجھے چھوڑ دیا اور سارا حال اُن سے کہا بیگم صاحبہ کو سن کر ہنسی آگئی لیکن انہوں نے فوراً ہی منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ انہیں معلوم تھا کہ مرزا صاحب کو اوّل تو غصہ آتا ہی نہیں اور اگر آجائے تو پھر کسی طرح رُکتا بھی نہیں۔ یہ بات سارے گھر میں مشہور ہو گئی۔ اور مرزا صاحب سے پوشیدہ ہر شخص ہی ہنستا تھا۔

شام کے قریب جب مرزا صاحب کا غصہ ذرا ہلکا ہوا۔ تو میں نے سنا کہ بیگم صاحبہ اُنہیں سمجھا رہی ہیں "آپ نے خواہ مخواہ اس یتیم بچے پر ظلم کیا۔ وہ تو سارا دن ہنسی مذاق سے ہم لوگوں کو خوش کیا کرتا ہے۔ بازار سے بھیجوں تو اور وں سے دگنی چیز لاتا ہے ایسا نوکر ہمیں کبھی نہ ملیگا۔ ہر کام اِس سلیقے اور صفائی سے کرتا ہے کہ کیا بتاؤں، جانے کس شریف کی اولاد ہے اور یتیم ہو کر ایسی سختیاں اٹھا رہا ہے"۔

مرزا صاحب بھی اب زیادہ خفا نہ تھے بولے" اور تو خیر کوئی بات ہوئی ہم تو اس کے سوٹ پہننے کی داد دینگے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ کمبخت اِس قدر ذہین ہے لیکن اس وقت سوٹ پہنکر آنے کا موقع بالکل نہ تھا"۔

بیگم صاحبہ نے کہا۔ "وہ بے چارہ موقع بے موقع کیا جانے۔ غریب پر رحم ہی کرنا چاہیئے۔ ہم بھی بچوں والے ہیں"۔

تھوڑی دیر بعد مرزا صاحب نے مجھے آواز دی۔ "شمّو، اِدھر آؤ"

میں فوراً دست بستہ حاضر ہوا۔

مرزا صاحب شمّو۔ تمہیں کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی ؟

مَیں۔ جی بالکل نہیں۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

مرزا صاحب۔ اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟ آئندہ بھی ایسی شرارت کرو گے؟

میں۔ حضور میری مجال نہیں شرارت کرنے کی۔

مرزا صاحب۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنے قصور سے شرمسار ضرور ہو؟

میں نے نگاہ نیچی کر لی اور شرمندگی کے انداز میں مسکرانے لگا۔

مرزا صاحب۔ (جیب سے پانچ روپے نکالکر) لو یہ تمھیں دودھ کیلئے دیئے جاتے ہیں۔

میں۔ سرکار پانچ روپیہ کا دودھ کیا ہوگا؟

مرزا صاحب۔ (مسکرا کر) یہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ تم پانچ روپیہ کا دودھ یکبارگی وقت خریدنا چاہتے ہو۔

بیگم صاحبہ۔ (جلدی سے تین روپے اُٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے) لے شمو! بس اب چپ رہ (مرزا صاحب کو مخاطب کر کے) بڑا سیر چشم لڑکا ہے۔

میں سلام کر کے مسکراتا ہوا اپنی جگہ پر واپس آگیا۔

عام طور پر گھر کے ملازموں کی عادت تھی۔ کہ جب کبھی میرے پاس کوئی روپیہ وغیرہ دیکھتے۔ خواہ میری تنخواہ ہی سے ہو۔ مجھے بھولا بھالا اور بیوقوف سمجھ کر فوراً اُسے اُڑانے کے حیلے بہانے تراشنے لگتے۔ چنانچہ اِس دفعہ بھی ایسا ہی ہوا۔

سب سے پہلے جو شخص باہر ڈیوڑھی پر ملازم تھا، نہایت مغموم صورت بنا کر میرے پاس آ بیٹھا اور بولا "آج گھر میں کچھ نہیں پکا۔ فاقہ ہے۔"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

میں - کیوں بھائی کیا بات ہے جو ایسے ہی فاقوں پر نوبت آ گئی ؟

وہی ملازم - بھائی شمّو کیا کہوں، گھر والی آٹھ پہر بیمار رہتی ہے - جو چار پیسے یہاں سے ملتے ہیں وہ بھی بال بچے کا پیٹ کاٹ کر دوا دارُو کے بھینٹ چڑھ جاتے ہیں - تم ہی بتاؤ کیا کروں اور کہاں جاؤں (ذرا ٹھہر کر) اگر کہیں سے تنخواہ ملنے تک دو تین روپے مِل جاتے تو میری مشکل "کُشا" ہو جاتی - دیکھئے ایک تم ہی دین داتا نظر آتے ہو - اور کہاں مانگنے جاؤں ؟"

میں نے چپکے سے دو روپیہ نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور کہا کسی سے بات نہ کرنا - اس نے کہا "میری کیا عقل چرخ میں آ گئی ہے جو لوگوں سے کہتا پھروں گا"

اِس کے بعد جب میں آگ جلا رہا تھا - تو ماما بولی " ارے شمّو سُنتی ہوں سرکار سے تجھے پانچ روپیہ کا انعام مِلا ہے "

میں ہاں مِلا تو ہے -

ماما - لا تو پھر میرا حق !

میں - قینچیاں کھاتے کھاتے بیٹھے تو میری اُدھڑ گئی اور حق تیرا کہاں سے آ گیا ؟

ماما - نہ میرے بھائی ! میں ایک روپیہ تجھ سے قرض کر کے مانگتی ہوں - قسم ہے مجھے قرآن پاک کی، اگلے مہینے دے دونگی - تیری بھاجی کئی دن سے ننگے سر پھر رہی ہے اس کے لئے اوڑھنی لاؤنگی -

مجھے خوب معلوم تھا کہ اِس قسم کے تمام قرض ہمیشہ واجب الادا ہی رہ جایا کرتے ہیں لیکن پھر بھی میں نے ایک روپیہ نکال کر ماما کو دے دیا اور

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ساتھ ہی کہا۔"جا تو اوڑھنی خرید لے، میرا قمیص خواہ پھٹا ہی رہے"۔
وُہ بولی "مجھے کپڑوں کی کیا کمی ہے، سرکار مجھ پر مہربان ہیں"۔
رات کے وقت جب میں اپنی کوٹھڑی کی طرف جانے لگا۔ تو سقے نے آواز دی۔" یار شمو! حقّہ تازہ ہے۔ اب تو کبھی مِل کر بیٹھتے ہی نہیں ادھر تو آو"
میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور خاموشی سے اس کے پاس جا بیٹھا۔
سقّا۔ (چارپائی سے اُٹھ کر) "ہائے میں مرا!"
میں۔ یار ابھی تمہارے مرنے کے دِن بہت دُور ہیں۔ کیوں بِن آئی کو بُلاتے ہو؟"
سقا۔ ارے ہم تو کہتے ہیں کل کی آئی آج آئے۔ کسی کی آئی ہی لگ جائے۔ آج گھر میں کچھ کھٹ پٹ ہو گئی ہوگی۔ ورنہ تم جان سے بیزار ہونیوالے تو نہیں۔
بھائی پانی ڈھوتے ڈھوتے میری پیٹھ دوہری ہو جاتی ہے۔ اور پاس اِتنا بھی نہیں بچتا کہ آدمی گھر والی کے طعنوں ہی سے چھوٹ سکے۔ اِس جینے سے تو مرنا بھلا۔ گور میں کوئی طعنہ دینے تو نہیں آئیگا۔ اب کل ہی بھائی اور بھاوج آ رہے ہیں۔ تم ہی کہو گھر میں تو روٹی کا بھی رونا پڑا ہے۔ انکی خاطر تواضع کہاں سے ہوگی۔ پہلے تو میں نے کہا تھا کہ کہیں چند دِن کے لئے نِکل جاوٴں۔
میں۔ ہاں بھئی بڑی مشکل بنی۔
سقا۔ یار کیا بات ہے اگر کہیں سے دو تین روپے کا انتظام کر دو۔ کبھی کے رکھے رکھائے ہی سہی۔
میں۔ قسم ہے مجھے کلام پاک کی جو میرے پاس ایک دمڑی بھی ہو۔ اپنی پھٹی

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ہوئی آستین دکھاکر) اگر پاس کچھ ہوتا تو میرا یہی حال رہتا؟

سقا۔ بھائی کیوں ایمان گنواتے ہو۔ ابھی ماما کا لڑکا کریم کہہ رہا تھا۔ تمہیں سرکار سے بڑا بھاری انعام ملا ہے۔

میں۔ ہاں ملا تو تھا لیکن میرے پاس ٹکنے کون دیتا ہے۔ اسی وقت ماما اور امیر بخش نے ادھار لے لیا۔

سقا۔ (غضبناک لہجہ میں) ستیاناس ہو اس کٹنی ماما کا۔ یہ تو ڈائن ہے ڈائن پیسے کی بو پا لیتی ہے ——— اور یہ امیر بخش۔ ٹھہر تو جائیے افیونچیوں کا افیونچی۔ صبح تک اسکی داڑھی کا ایک بال بھی چھوڑا ہو تو بخشو نام نہیں مجھے معلوم ہیں اس کی کارروائیاں۔ اور تم بھی نرے اُلو ہو، اصل اُلو۔

بھائی میں پردیسی کیا جانوں، اگر تم ذرا پہلے مانگ لیتے۔ تو تم سے کون چھپا تھا؟ سویرے سے کئی بار بات میری زبان تک آئی، پر میں نے کہا۔ گھر کی بات ہے۔ ہم تم کوئی غیر تھوڑا ہی ہیں۔

آخر مایوس ہو کر سقے نے چند اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا۔ "جاؤ اب بھائی سو رہو۔ تمہاری آواز نیند سے بھاری معلوم ہو رہی ہے"۔

میں نے جاتے ہوئے دانستہ طور پر ایک روپیہ وہاں گرا دیا۔ اس بیچارے نے سمجھا۔ بیخبری میں مجھ سے گر گیا ہے اور اس انداز سے اُسے اُٹھا کہ جیب میں ڈالا۔ گویا واجب ہی یہی تھا۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں کسی ضرورت سے مرزا صاحب کے کمرے میں گیا۔ وہ کہیں باہر تشریف لے جا چکے تھے۔ سامنے میز پر "ٹائمز آف انڈیا"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کا تازہ پرچہ رکھا تھا۔ اخبار دیکھے مدّت گزر چکی تھی۔ جس طرح ایک بھوکا آدمی مٹھائی پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالتا ہے۔ وہی حالت اخبار کو دیکھ کر میری ہوئی۔ آخر ادھر اُدھر دیکھ کر اخبار اٹھا لیا۔ ایک انگریز حاکم اور ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر کی دلپذیر اور محققانہ گفتگو نے مجھے ایسا محو کر لیا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ کب میں پڑھتے پڑھتے مرزا صاحب کی بڑی سی آرام کرسی پر لیٹ گیا تھا۔ اتنے میں ایک نہایت ہلکی سی آواز سنائی دی۔ "دیکھو دیکھو ادھر کیا ہو رہا ہے"۔ اس کے بعد کسی نے آہستہ کہا۔ "ہیں یہ تو سچ مچ پڑھ رہا ہے"۔ پھر کسی نے دبی زبان سے کہا۔ "ذرا خاموش تماشا دیکھتے رہو"۔

صرف ایک لمحہ کے لیے میں ذرا گھبرایا لیکن جلد ہی مجھے تدبیر سوجھ گئی میں نے اسی طرح برابر اخبار پر نظر جمائے ہوئے ایک تصویر کا منہ چڑانا شروع کر دیا۔ آنکھ ناک اور ہونٹوں سے عجیب عجیب شکلیں بنانے لگا۔ اتنے میں مرزا صاحب کا چھوٹا صاحبزادہ اور دونوں بڑی لڑکیاں مسکراتی ہوئی کمرے میں آ گئیں۔ خورشید بولیں۔ "یہ کیا حرکت ہے"؟ میں فوراً کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور تصویر دکھا کر کہا۔ "میں ذرا اس مردوئے کا منہ چڑا رہا تھا۔ بی بی دیکھنا۔ خدا نے شکل میرے ساتھی کو اگر بھونڈی دی تھی تو کہیں چھپا کر رکھتا نہ کہ لگا ہے اُلٹا اخباروں میں لکھا کر "نشر کرنے"۔

خورشید۔ بیوقوف یہ تو کسی ریاست کا راجہ ہے۔

مرزا صاحب کا لڑکا ممتاز۔ ارے بدتمیز یہ تو بتا۔ تجھے ابا جان کی کرسی پر بیٹھنے کو کس نے کہا تھا؟

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

میں "میاں میری مجال نہیں۔ یقین جانو کہ یہ صورت دیکھتے ہی مجھ پر غشی طاری ہوگئی۔ نہ جانے کہیں چوٹ آجاتی۔ قسمت اچھی تھی جو کرسی پر گرا"۔ اس پر سب ہنس پڑے۔

خورشید بیگم "مجھے کتابوں سے لگاؤ تو بہت ہے۔ لیکن تعجب ہے۔ کہ تو نے پڑھا خاک بھی نہیں"۔

میں۔ بی بی، اللہ کی قسم، مجھے پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ (ٹائمز آف انڈیا کا پرچہ اٹھا کر قمر کو مخاطب کرتے ہوئے) بی بی آپ ہماری اُستاد بن جایئے اور آج ہی سے سبق پڑھانا شروع کر دیجیے"۔

قمر۔ (ہنس کر) واقعی ایسے قابل آدمی کو پہلے پہل "ٹائمز آف انڈیا" ہی سے سبق پڑھنا چاہیئے"۔

اِتنے میں مرزا صاحب کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور سب اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

اِسی طرح ہنسی خوشی یہ دِن گزرتے رہے ہنسی مذاق اور کام کاج کی مشغولیتوں کے درمیان مَیں قمر کی عادات و خصائل کو پورے غور و فکر سے جانچتا رہا اور اسے بالکل اپنی طبیعت کے لِئے موزوں پایا۔ اُس کی بھولی بھالی سادہ سی طبیعت جس میں ذرا سے غور و فکر نے شامل ہو کر اُسے اور بھی دِلکش بنا دیا تھا میرے مطمئن کرنے کے لِئے کافی تھی۔

بالآخر میرے ایما سے ایک عزیز دوست کا خط میرے لِئے قمر کی خواستگاری کے متعلق مرزا صاحب کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اپنے مرحوم دوست کے بیٹے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کے متعلق مرزا صاحب کو لمبی چوڑی تفصیلات معلوم کرنے کی زیادہ حاجت نہ تھی۔ شاید بچپن میں وہ مجھے کبھی دیکھ بھی چکے ہونگے۔ میری شکل و صورت قابلیت، جائداد اور چال چلن کے متعلق خط میں میرے وکیل دوست نے "وکیلانہ" وضاحت سے کام لیا تھا۔ اسی روز اس خط کی ایک نقل میرے پاس بھی پہنچ چکی تھی۔ مَیں گھر کے ایک ایک آدمی کے چہرے پر امید و بیم کی نگاہیں ڈالتا کہ دیکھیں اب تقدیر کیا فیصلہ کرتی ہے۔

مرزا صاحب وُہ خط پاکر کچھ مطمئن معلوم ہوتے تھے۔ اور بیگم صاحبہ تو عیاں طور پر خوش تھیں۔ بلکہ میں نے اُنہیں اُن کی بڑی صاحبزادی کسے یہ کہتے بھی سن لیا۔ کہ خورشید مجھے اطمینان تو اس بات سے ہے۔ کہ وہاں قمر کی کوئی ساس نند نہ ہوگی۔ ساس نندوں نے تمہاری جو قدر پہچانی وُہ کسی سے چھُپی ہوئی نہیں"!

مجھے یہ سن کر اطمینان ہوا۔ آخر چند دن صلاح مشورے میں گزرے۔ بعض وقت بحث مباحثے میں کھانے کو بھی خاصی دیر ہو جاتی رہی۔ اِس پر ماما کی تنقید جو تننگ آگر وقتاً فوقتاً گھر کے آدمیوں پر میرے سامنے کیا کرتی بیحد دلچسپ ہوتی آخر چند خطوط آنے جانے کے بعد معاملہ تقریباً طے ہو گیا۔ اور کچھ دن بعد یہ خبر عام طور پر گھر میں مشہور ہوگئی۔ منگنی کی کوئی خاص رسم ادا نہ ہوئی۔ کیونکہ "دُولھا والے شادی کی تاریخ بہت جلد مقرر کرنا چاہتے تھے۔

اِسی دَوران میں مجھے ایک اَور شرارت کا خیال آیا۔ ایک دِن قمر میری کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ مَیں نے کہا۔ بی بی ہنس لو جسقدر جی چاہے۔ آپ

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

تو اب اپنے گھر سدھاریں گی۔ پھر کاہے کو کبھی غریب شمو کی باتیں آپ کو یاد آنے لگیں"۔ قمر بولی "چپ رہ میں ابا جان سے کہونگی۔"

ہیں۔ (ہنسکر) نہیں بی بی سچ کہتا ہوں شمیم صاحب بڑے ہنس مکھ آدمی ہیں میرے ہموطن ہیں۔ سب سے پہلے میں انہی کے ہاں ملازم ہوا تھا۔ ہر وقت ان کے دروازے پر بھانڈ میراثیوں کا مجمع رہتا ہے۔ نت نئے کھیل تماشے ہوا کرتے ہیں آپ وہاں گئیں۔ تو کبھی ہم لوگوں کو کم ہی یاد کیا کریں گی۔ ان موٹی کتابوں کو جن سے آپ ہر وقت مغزماری کیا کرتی ہیں ہمارے شمیم صاحب نے کبھی چھوا تک نہیں بس لوگوں کا دل خوش رکھتے ہیں"

قمر۔ (گھبرا کر) "ابا جان مجھے پیٹیں گے"۔

ہیں۔ "نہ بی بی واسطہ ہے خدا کا کہیں وہی بات نہ کرنا جو شمیم صاحب کی صراحی جس میں ان کے پینے کی کوئی سرخ سرخ چیز تھی، لوٹ جانے سے ہوئی تھی۔ اس روز مجھ غریب کو انہوں نے باندھ کر مارا تھا۔"

قمر۔ (حد درجہ پریشان ہو کر) "کیا بکتے ہو؟"

ہیں۔ "بی بی آپ ناراض نہ ہوں، ایمان کی کہتا ہوں شمیم صاحب بڑے نیک آدمی ہیں وہ نقصان بھی مجھ سے بڑا بھاری ہو گیا تھا۔ شاید صراحی میں ان کی کوئی دوا تھی"۔

قمر پژمردہ صورت بناتے ہوئے یہ کہہ کر چلی گئی "صراحی میں دوا تیرا باپ ہی رکھتا ہو گا"۔

اِس کے بعد کئی گھنٹے تک وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی۔ یہاں تک

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کہ میں بھی گھبرا گیا۔ آخر بیگم صاحبہ نے کہا۔ "خورشید! آج قمر کیوں نہیں دکھائی دیتی۔ دیکھ تو کہیں اندر کمرے میں تو نہیں گئی۔" تھوڑی دیر بعد خورشید قمر کا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر آئیں اور ہنسکر کہا۔ "اماں دیکھیئے تو نالائق کی حرکت اندر کمرے میں تمام تکیہ رو رو کر اس نے بھگو ڈالا ہے۔"

بیگم صاحبہ۔ اُوئی توبہ۔ رونے سے کہیں درد کم ہوا کرتا ہے۔ بھلا ہمیں کیوں نہ بتایا۔ دیکھو بی اس کی بات۔ اندر اکیلی پڑی روتی رہی (مجھ سے) جا تو شمو! بھاگ کر ڈاکٹر سے سر درد کی ٹکیہ لیتا آ۔ (قمر سے) آ میری بیٹی۔ میں تیرا سر دبا دوں۔ یہ کہکر قمر کا سر دبانے بیٹھ گئیں مجھے ہنسی آ گئی۔

درد سر کی ٹکیہ تو میں لے آیا۔ لیکن میں سمجھ گیا کہ سر درد کا صرف بہانہ تھا اور یہ سب میری باتوں کا اثر ہے۔ بیگم صاحبہ سے کہا۔ "بی بی کو ٹکیہ کھانے کیلئے نہ دیجیئے۔ ایک دن میاں نے کھائی تھی تو وہ بہت کمزور ہو گئے تھے کہتے ہیں کمزوری آدمی پر غشی طاری کر دیتی ہے۔ بی بی کو دودھ میں برف اور سوڈا ملا کر پلوا دیجیئے۔ بہت جلد آرام ہو جائے گا۔"

بیگم صاحبہ ٹکیہ کو دور پھینک کر بولیں۔ "بھاڑ میں جائے ایسی دوا جو غشی طاری کر دیتی ہو۔"

قمر نے کہا۔ "اماں آپ کے دبانے سے اب مجھے آرام ہو گیا ہے۔"

موقع دیکھ کر میں نے قمر کی موجودگی میں بیگم صاحبہ کے سامنے ان کے داماد کی تعریفوں (یا دوسرے الفاظ میں اپنی تعریفوں) کے پل باندھ

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

دیئے۔ بیگم صاحبہ نہال ہو گئیں اور قمر کے دل سے بھی میری ان باتوں کا اثر یا تو بالکل زائل ہو گیا۔ یا بالکل ہی کم رہ گیا۔ کیونکہ اس کے بعد اُسے پھر کبھی سردرد کی شکایت نہیں ہوئی۔

کچھ روز بعد میرے وُہی وکیل دوست جو عمر میں مجھ سے بڑے ہونے کے علاوہ کسی دُور کے رشتے سے میرے بھائی بھی ہوتے تھے۔ مرزا صاحب موصوف کے دولتکدہ پر آ پہنچے۔ بظاہر وُہ مرزا صاحب سے ضروری معاملات طے کرنے اور شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لئے آئے تھے۔ لیکن ان کے آنے کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ میں اپنی آئندہ تجویزوں کے متعلق سب کچھ اُن سے زبانی طے کر لوں۔ دوسرے شادی کے دِن پہننے کے لِئے وُہ میرے لئے کپڑے اور چند دوسری ضروری چیزیں بھی پوشیدہ طور پر لائے تھے۔

ایک عرصے کے بعد میری اور ان کی ملاقات یوں ہوئی۔ وُہ اور مرزا صاحب چار بجے باغیچے میں تکلّف کرسیوں پر آرام سے بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ میں چائے کی کشتی اٹھائے ہوئے آیا۔ اُس روز میرے کپڑے معمول سے بھی زیادہ میلے تھے۔ بلکہ آتے آتے راستے میں میں نے ایک دو جگہ سے اپنے قمیص کو عمداً پھاڑ بھی ڈالا۔ میرے پاؤں ننگے اور گرد آلود ہونے کے علاوہ چہرے پر بھی کہیں کہیں سیاہی کے نامعلوم سے دھبّے تھے چائے کی کشتی میز پر رکھ کر میں نے جھک کر سلام کیا۔ میرے دوست نے جواب میں نہایت شان سے صرف سر کو ذرا سی جنبش دی۔ لیکن پھر کسی خیال سے ذرا نظر بھر کر میری طرف دیکھا۔ اور معاً مجھے پہچان گئے۔ ان

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر مرزا صاحب بولے۔ "یہ ہمارے ایک نہایت دلچسپ ملازم ہیں۔ بعض وقت سوٹ بھی پہنتے ہیں۔"

میری ہیئت کذائی کو دیکھ کر میرے دوست کا چہرہ ہنسی ضبط کرنے سے سرخ ہو رہا تھا۔ مرزا صاحب کا یہ کہنا تھا کہ انہوں نے غنیمت جان کر ایک قہقہہ لگایا بلکہ ساتھ تقریباً اچھل بھی پڑے اور بولے۔ "بہت خوب سوٹ بھی پہنتے ہیں" مرزا صاحب بولے "جی ہاں"۔ اس پر وکیل صاحب نے خواہ مخواہ دوسرا قہقہہ لگا دیا گویا یہ "جی ہاں" بھی کوئی بڑا لطیفہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد مرزا صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "شمّو!" میرے دوست نے ہنسنے کا تیسرا موقع حاصل کیا۔ ایک زبردست قہقہہ لگا کر بولے "نام بھی بڑا دلچسپ ہے شمّو"۔ پھر ایک اور قہقہہ لگا دیا۔ میری موجودگی نے وکیل صاحب کی تمام متانت کو بالائے طاق رکھ دیا۔ مرزا صاحب کی معمولی سے معمولی بات سن کر جس میں مذاق کا ذرا سا شائبہ بھی پاتے۔ بے اختیار ہنس دیتے۔ حتیٰ کہ بعض جگہ ان کی ہنسی مجھے مضحکہ خیز معلوم ہونے لگی۔ اور میں نے مناسب سمجھا کہ وہاں سے ہٹ جاؤں۔

مرزا صاحب اندر آئے تو بیگم صاحبہ کے سامنے وکیل صاحب کی بذلہ سنجی، وسعت اخلاق، وسعت معلومات اور مدلل گفتگو کی بہت تعریف کی پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "نالائق آج تو نے اپنی حالت اس قدر ذلیل کیوں بنا رکھی تھی؟"

میں "سرکار اتنا عرصہ حضور کی خدمت میں رہ کر اتنی سی عقل کی بات بھی نہ سیکھتا کہ بڑے آدمیوں کے سامنے بن ٹھن کر جانا بڑی شرم کی بات ہے۔"

مرزا صاحب کوئی پرانی بات یاد کر کے مسکرانے لگے۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

آخر رات کے وقت جب سب اپنے اپنے کمروں میں سونے کیلئے چلے گئے تو میں چپکے سے اپنے دوست کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ میرے انتظار میں جاگ ہی رہے تھے۔ میں نے ایک کرسی اُن کے پلنگ کے قریب کھینچ لی اور بیٹھ گیا۔ وہ ہنس کر بولے "بھئی واللہ اس حالت میں تمہیں اپنے برابر بیٹھے ہوئے دیکھ کر تو میں بھی توہین محسوس کر رہا ہوں"

کچھ عرصہ میری موجودہ مضحکہ خیز وضع قطع پر گفتگو ہوتی رہی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر انہیں پہلے ہی سے سب حال معلوم نہ ہوتا تو قطعاً وہ مجھے اس صورت میں نہ پہچان سکتے۔ کہنے لگے۔ "اندازِ گفتگو کے علاوہ تم نے اپنی شکل و صورت کی طرز بھی کس اعجاز سے بدل ڈالی ہے" پھر ہنس کر بولے "موجودہ صورت میں تو مجھے کچھ نا امیدی سی ہو گئی ہے کہ تم پھر بھی کبھی اصلی شریفانہ شباہت اختیار کر سکو گے" میں نے ہنس کر کہا ع "چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند" مطمئن رہیئے!

آخر اصل معاملہ درپیش ہوا۔ ان کا اصرار تھا کہ اب میں یہاں سے چلا جاؤں اور میری تجویز یہ تھی کہ شادی کے دن تک یہیں رہوں۔ کیونکہ ان دونوں بیگم صاحبہ رخصت تو مجھے ہرگز نہ دینگی۔ باقی رہا خود بخود غائب ہو جانا۔ تو یوں وقت سے پہلے بنے بنائے کھیل کے بگڑ جانے کا کافی اندیشہ ہے۔"

میرے دوست نے ہنس کر کہا "ارے میاں اصل بات کیوں نہیں کہتے کہ اب یہاں سے شادی کئے بغیر ٹلنے کو جی نہیں چاہتا" میں نے مسکرا کر کہا "ہاں ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کیونکہ ایسے دلچسپ موقعے زندگی میں بار بار نصیب نہیں ہوا کرتے۔"

آخری تجویز یہ ہوئی۔ کہ مجھے گاڑی کے صحیح وقت سے پورے طور پر مطلع کر

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

دیا جائے میں موٹر میں بیٹھ کر ایک دو اسٹیشن آگے پہنچ جاؤں اور وہاں سے بارات کے ساتھ مل کر بحیثیت دولھا کے مرزا صاحب کے دولت کدہ پر پہنچوں۔ میرے دوست کو اس تجویز سے کوئی خاص اطمینان تو نہ ہوا لیکن میرا اطمینان اسی میں دیکھ کر وُہ دوسرے روز رخصت ہو گئے۔

شادی کیلئے کل ساز و سامان میرے حسب منشا کیل صاحب اور اُنکی بیوی کے اہتمام میں تیار ہو چکا تھا اور اس طرف سے تقریباً ہم پیغام بھیجنے سے بھی پہلے فرصت پا چکے تھے

اب اِدھر بھی زور و شور سے تیاریاں شروع ہو ہیں۔ شادی میں صرف پندرہ بیس روز باقی تھے۔ قمر کا جہیز بھی بڑی حد تک بیگم صاحبہ پہلے ہی تیار کر چکی تھیں۔ اب ہر روز قسم قسم کے جوڑے ٹنکے جانے لگے۔ نئے نئے ساز و سامان خریدے جاتے۔ بعض وقت عجیب عجیب رسمیں ادا ہوتیں۔ اِدھر مجھے کہیں دم لینے کی فرصت نہ ملتی۔ گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا اور بیگم صاحبہ کی پرشفقت نگاہ ہر کام کیلئے مجھی کو منتخب کرتی ہیں جب کبھی اور لوگوں کے کام سے فرصت پاتا فوراً قمر کے پاس جا کر کہتا۔ "بی بی لایئے آپکا بھی کوئی کام ہو تو کر دوں۔" آپ بھی کیا یاد کریں گی کہ کوئی شمّو ہوا کرتا تھا۔

آہستہ آہستہ وُہ دن بھی گزر گئے اور آخر شادی کا دِن آ پہنچا۔ شام کے وقت سات بجے برات آنیوالی تھی۔ گھر میں رفتہ رفتہ اندر باہر مہمان جمع ہو رہے تھے لیکن اس روز بھی بار بار اندر سے بیگم صاحبہ کا بلاوا آتا کہ شمّو یہ کرو، شمّو وہ کرو۔ گھر کے لوگ بارات کے استقبال کیلئے سٹیشن پر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اِدھر میرا یہ حال تھا کہ کہیں دم لینے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ آخر چار بج گئے میں ذرا گھبرایا کہ وقت تو ہاتھ سے نکلا جا

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

رہا ہے اور کام ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آتے۔ اتنے میں قمر کے بڑے بھائی امتیاز آئے اور کہنے لگے "شمو ذرا میرے سیاہ بوٹ پر پالش تو لگا ڈال"۔ میں نے کہا "بہت بہتر سرکار"۔ اور بوٹ لاکر پالش کرنے لگا۔ وہ ہنستے ہوئے بولے "ایسا اچھا پالش کیجیو کہ دولہا والے بھی تمہاری سلیقہ مندی کے قائل ہو جائیں"۔ میں نے کہا "سرکار خود دولہا میاں کا بوٹ بھی مات نہ ہو جائے تو شمو نام نہیں"۔

بوٹ ہاتھ سے رکھا نہ تھا کہ ماما چیختی ہوئی آگئی کہ "باورچی تیری جان کو رو رہا ہے صبح جو طشتریاں تجھے صاف کرنے کیلئے دی تھیں وہ تو اسی طرح رکھی ہیں"۔ میں نے تنگ آ کر کہا "تیرے ہاتھ کہیں ٹوٹ تو نہیں گئے جا مجھے خود بہت کام ہیں"۔ ابھی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ مرزا صاحب کی آواز سنائی دی "شمو مہمانوں کیلئے حقے تازہ کئے یا نہیں؟" جوں توں کر کے میں نے کوئی نصف چلمیں بھری ہونگی کہ مرزا صاحب کی چھوٹی لڑکی ستارہ آگئی اور بولی "شمو تجھے میری چھوٹی آپا اور بڑی دونوں بلا رہی ہیں"۔ میں نے سب کام وہیں چھوڑے اور پچھلی طرف سے قمر کے دروازے پر پہنچا۔ اُنکی کلائی کی قیمتی گھڑی جو جہیز میں دی جانیوالی تھی۔ کسی شوخ چنچل سہیلی کی بے پناہ دستبرد کی نذر ہو گئی تھی۔ مجھ سے کہنے لگیں "کلائی پر سے ایک سنہرا حلقہ ٹوٹ گیا ہے۔ سنار سے جڑوا کر بہت جلد چپکے سے لے آ"۔ میں نے گھڑی جیب میں رکھ لی۔ پھر خورشید ادھر آئیں اور بولیں "شمو! ثریا کے بالوں میں باندھنے کا فیتہ پہلے جلدی سے خرید کر مجھے لا دے"۔ پھر پانچ روپیہ کا ایک نوٹ نکال کر "ہاں سن! ننھے کا نیا بوٹ کہیں مہمانوں میں ادھر اُدھر ہو گیا ہے اسکے پاؤں کا نمبر بتا کر ایک بوٹ بھی لیتے آنا سن لیا؟" میں نے بہت بہتر کہہ کر بھاگنا چاہا کہ اتنے میں بیگم صاحبہ بھی آنکلیں۔ مجھے دیکھ کر فوراً بولیں "شمو مجھے تیری ہی تلاش تھی

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ذرا بھاگتا ہوا بازار جا اور وہاں سے ایک ٹوکری اچھے اچھے پالنوں کی خرید لا۔"
میں نے کہا۔"بہتر سرکار میں بازار ہی جا رہا ہوں"۔ وہاں سے رخصت ہوا تو پھر سامنے
میاں امتیاز کھڑے ملے۔ مجھ سے کہا۔"ستو کہاں جاتا ہے؟" میں نے کہا۔"سرکار بازار
جا رہا ہوں بہت جلدی کا کام ہے"۔ وہ جیب سے کچھ پیسے نکالتے ہوئے بولے"اچھا
تو پھر بڑا شامیانہ باندھنے کے لئے تھوڑی سی ڈوری بھی لیتے آنا۔" میں پھر بھاگنے
لگا۔ پھر آواز دیکر بولے۔"ارے سن! جلد آنا۔ برات اب آیا ہی چاہتی ہے۔" میں نے
کہا۔"ابھی آیا سرکار"۔ اور پیچھا چھڑا کر بازار کی طرف لپکا۔ اتنے میں پیچھے سے میاں
ممتاز کی آواز سنائی دی۔ "ابے ستو کے بچے! نامعقول! ابا کب سے تیری تلاش کر رہے
ہیں اور تو یہاں آرام سے سیر کر رہا ہے"۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔"ابھی
آیا۔ اور تیزی سے آگے نکل گیا ابھی سنار کی دکان سے حلقہ چھڑا کر نکلا ہی تھا کہ
پانچ بج گئے۔ میں نے کہا۔ کہ اب اگر لوٹ کر گھر گیا۔ تو نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ برات میرے
بغیر ہی گھر پر پہنچ جائیگی۔ باقی چیزیں خریدنے کا ارادہ پہلے ہی سے ترک کر
چکا تھا۔ وہاں سے نکل کر سیدھا اس ہوٹل کیطرف روانہ ہوا جہاں ایک کمرہ میں نے
مدت سے خط وغیرہ منگانے کیلئے کرایہ پر لے رکھا تھا ہوٹل میں پہنچکر غسل کیا اگر میری بات
کو مبالغہ نہ سمجھا جائے تو یقین مانئے مجھے منہ دھوئے اس روز تقریباً ایک ہفتہ گزر
چکا تھا۔ نہانے میں خاصہ وقت صرف ہوا۔ اسکے بعد میں نے اپنا نفیس ترین سوٹ پہنا
آنکھوں پر چشمہ بھی لگا لیا۔ اب آئینہ دیکھا تو میرے چہرے کی پہلی اور موجودہ ہیئت میں
زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا اب کس کی مجال ہے کہ میری نسبت "ستو"
ہونے کا خیال بھی دل میں لا سکے۔ ایک مدت کے بعد میں نے پاؤں میں بوٹ پہنا۔ اسکی

CC-0 In Public Domain. Digitized by eGangotri

ایڑیاں خاص طور پر ذرا اونچی دیکھ کر خریدا گیا تھا۔ اب مجھے یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ میرا قد درمیانے کی حد سے گزر کر خاصہ لمبا معلوم ہو رہا ہے۔

جب ہوٹل سے نکلا تو معلوم ہوا کہ وقت بالکل قریب آپہنچا ہے۔ جلد جلد ایک موٹر کرایہ پر لی جو ہوا کی سی تیزی سے فراٹے بھرتی ہوئی چلی موعودہ سٹیشن پر پہنچکر میں نے ٹکٹ خریدا۔ بکنگ کلرک کا خیال تھا کہ گاڑی بہت جلد چھوٹنے والی ہے اور واقعی پلیٹ فارم پر پہنچکر دفعتہً میری آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ جب میں نے دیکھا کہ گاڑی نہایت سرعت کیساتھ پلیٹ فارم سے نکلی جا رہی ہے میرے دوست گاڑی کی کھڑکیوں سے باہر جھکے ہوئے پریشان نگاہوں کے ساتھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پلیٹ فارم پر میری تلاش میں نگاہیں ڈال رہے تھے۔ مجھے کچھ نہ سوجھتا تھا۔ بے اختیار میں نے جیب سے رومال نکال کر مایوسانہ انداز میں ہلانا شروع کیا۔ جواب میں کئی ہاتھ ٹوپیاں اور رومال بلند ہوئے ایک لمحہ کے بعد میں سنبھل گیا۔ ہاتھ کے اشارے سے انہیں مطمئن کیا۔ اور تقریباً دوڑتا ہوا پلیٹ فارم سے باہر نکلنے کی غرض سے واپس مڑا۔ ایک صاحب جو مسکین صورت ملاؤں کی سی وضع قطع بنائے سامنے کھڑے تھے۔ خواہ مخواہ میرا راستہ روک کر بولے "صاحب بہادر ذرا میرے ٹکٹ کا نمبر تو پڑھتے جائیے۔ اور بتائیے کس کلاس کا ہے"۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا "بکواس مت کیجیئے"۔ اور میں بھاگ کر آگے نکل گیا۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ اس بیچارے نے شاید عمر میں پہلی اور آخری مرتبہ تیسرے درجہ کو چھوڑ کر کسی اور درجہ کا ٹکٹ خریدا ہوگا۔

خوش قسمتی سے وہی موٹر سامنے کھڑی مل گئی۔ میں اُچک کر اس میں

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

سوار ہو گیا۔ اور شوفر سے صرف یہ کہا۔ "جلدی کرو جلدی"۔

شوفر۔ اب کہاں تشریف لے جایئے گا؟"

مَیں۔ "وہیں وہیں، خدا کے لیے جلدی کرو"۔

شوفر نے مجھے حواس باختہ دیکھ کر خود ہی موٹر کا رخ باہر کی طرف پھیر لیا۔ موٹر چلی تو مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ اور میں نے شوفر سے اپنا مدعا بیان کیا۔ آخر کار موٹر پھر واپس اس سٹیشن کی جانب روانہ ہوئی جدھر میری برات والی گاڑی تیزی سے جا رہی تھی۔ اب اس گاڑی کو صرف راستے میں ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹھہرنا تھا۔ اور ایک لمحہ کی دیر بھی مجھے گوارا نہ تھی۔ منٹ منٹ کے بعد میں جیب سے گھڑی نکال کر دیکھتا۔ وقت کے ساتھ ہی ساتھ میرا دل بھی اُڑا جا رہا تھا۔ ہزار ہا قسم کی بے چینیوں کے علاوہ ایک خیال یہ بھی تھا کہ اگر وقت پر وہاں بھی نہ پہنچا۔ تو میرے دوست مجھے پرلے درجے کا بے تدبیر احمق اور کاہل سمجھیں گے۔ مَیں نے گھبرا کر شوفر سے کہا "تمہاری موٹر کی رفتار گدھے کی چال سے کسی طرح کم نہیں"۔

شوفر۔ صاحب موٹر تقریباً پچیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی ہے"۔

مَیں بار بار مارے اضطراب کے موٹر میں تقریباً اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا اور کہتا۔ "رفتار جس قدر تیز ہو سکے کرو"۔ شوفر بیچارہ الگ حیران تھا کہ یہ کون پاگل آج میری موٹر میں گھس آیا ہے لیکن میرا یہ حال تھا کہ نشست پر ایک جگہ آرام سے بیٹھنا بھی دشوار تھا۔ بار بار پہلو بدلتا کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف۔

مَیں نے ایک بار پھر گھڑی نکالی۔ وقت بہت ہی کم رہ گیا تھا۔ فوراً جیب سے پانچ روپے نکالے اور شوفر کی طرف پھینک کر کہا۔ "اور زیادہ انعام

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ملے گا۔ اگر تم نے رفتار تیز کر دی"

شوفر نے رفتار ذرا بڑھا دی۔ جو اس وقت مجھے بہت کم معلوم ہوئی۔ میں نے کہا" رفتار ذرا اور تیز کر دو سڑک پر کوئی زیادہ آمد و رفت تو ہے نہیں"۔ شوفر کو شاید میری بات بہت مضحکہ خیز معلوم ہوئی۔ ہنسکر بولا" صاحب آپکو جلدی کی وجہ سے شاید معلوم نہیں ہو سکتا۔ ورنہ سڑک پر تو خاصی آمد و رفت ہے۔ اگر میں نے کہیں ایک دو کا خون کر دیا۔ تو راستے ہی میں رہ جاؤں گا"

میں نے بغیر اس کی بات پر غور کئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جس قدر روپے ہاتھ میں آئے۔ اس کی طرف پھینک کر بولا۔" کیا تمہاری موٹر کی رفتار ساٹھ پینسٹھ میل فی گھنٹہ نہیں ہو سکتی؟"

اب موٹر آندھی کی سی تیزی سے اُڑی جا رہی تھی لیکن غنیمت ہے کہ سٹیشن تک پہنچتے پہنچتے خیر یت ہی گزری اور کوئی خاص حادثہ پیش نہ آیا۔ موٹر سے اُتر جانے کے باوجود بھی پلیٹ فارم میں داخل ہونے تک میں اپنی ٹانگوں کو موٹر ہی میں تصور کئے رہا۔ پلیٹ فارم پر مرزا صاحب کے دونوں صاحبزادے اپنے کئی عزیزوں کی معیت میں براتیوں کے استقبال کیلئے پہلے ہی موجود تھے۔ گاڑی میرے دیکھتے دیکھتے آکر اسٹیشن پر رک گئی۔ غنیمت ہے کہ اس وقت کسی کو اور طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ تھی عین میرے سامنے ایک فرسٹ کلاس کا کمرہ تھا۔ میں "استقبالیہ کمیٹی" سے نظر بچا کر فوراً اس میں داخل ہو گیا۔ میرے پرانے کرمفرما وکیل دوست نے مجھے وہاں داخل ہوتے دیکھ لیا۔ اور بقول اُنکے اُس وقت ان کی جان میں جان آئی۔

میں پشت پر ہاتھ باندھے ذرا تن کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ تمام عزیزوں

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کی نگاہیں میری تلاش میں تھیں جلد ہی وکیل صاحب سب کو میرے درجے کے سامنے لے آئے مرزا صاحب کے صاحبزادوں اور دوسرے عزیزوں سے یہ کہکر میرا تعارف کرایا "یہ ہیں دولھا میاں بندہ کے عزیز دوست مسٹر شمیم احمد ایم اے" میرے برادران نسبتی نے عقیدتمندانہ محبت کی نگاہیں میرے چہرے پر ڈالیں اور نہایت پرجوش طریقے سے میرے ساتھ مصافحہ کیا۔ عین اسوقت مجھے اس ہستی کا خیال آیا جو چند گھنٹے پیشتر مسٹر امتیاز نے مجھے خیمہ باندھنے کی غرض سے لانے کو کہی تھی۔ آخر ہم سب موٹر گاڑیوں میں بیٹھکر مرزا صاحب کے مکان کی طرف روانہ ہوئے میاں ممتاز جو کچھ عرصہ ہوا مجھے مرزا صاحب کی کرسی پر بیٹھے دیکھ کر سخت برہم ہوئے تھے۔ اس وقت نہایت فخر یہ انداز سے میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے جارہے تھے۔

موٹر سے اترنے کے بعد سب سے پہلی آواز جو میرے کان میں پڑی یہ تھی۔ کہ ماما نہایت فصاحت و بلاغت سے کہہ رہی تھی "ارے ادر تو اور سنا ہے کہ موا بی بی قمر کی کلائی پر باندھنے والی دو ڈھائی سو کی "کلاک" بھی لیکر غارت ہو گیا"

مرزا صاحب مجھے دیکھ کر بیحد خوش ہوئے۔ جوش محبت میں مجھے گلے سے لگا لیا۔ اسوقت مجھے پورا اطمینان ہوا کہ کسی کے دل میں میرے "ستمو" ہونے کا شائبہ تک نہیں جو لوگ گھر میں ادھر ادھر پھر رہے تھے میرے کان انہیں کی آوازوں پر لگے رہے۔ کوئی کہتا "بھئی وقت پر دغا دیگیا" کوئی کہتا "دنیا میں کس پر بھروسہ کیا جائے؟" اور کوئی کہتا "بہتیر اتلاش کیا کہیں اس کا نام و نشان ہی نہیں ملتا" میں سب کچھ سنتا اور دل ہی دل میں مسکراتا۔

اب رات ہو چکی تھی۔ نکاح کے بعد فوراً میری طلبی اندر ہوئی۔ ابھی میں نے دہلیز میں قدم نہ رکھا تھا کہ بیگم صاحبہ کی آواز سنائی دی کسی سے کہہ رہی تھیں ہے ہے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کیا کروں دل نہیں مانتا کہ شمّو ایسا دغاباز تھا۔ میرا تو دل دھک دھک کر رہا ہے۔ باہر سڑکوں پر موٹریں اندھی ہوئی پھرتی ہیں۔ کہیں نیچے آ گر خدانخواستہ ......"

اتنے میں میں اندر داخل ہوا۔ سب سے پہلے بیگم صاحبہ کو سلام کیا۔ انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کرسی پر بیٹھنے کیلئے کہا۔ مستورات کے درمیان ایک کرسی پہلے ہی اس غرض سے رکھی ہوئی تھی۔ میں قدرے سر جھکا کر وہاں بیٹھ گیا بڑھیاں بوڑھیاں مجھ پر صدقے واری ہونے لگیں۔

سب سے پہلے مجھے بیگم صاحبہ نے سلامی دی۔ اس کے بعد خورشید سامنے آ بیٹھیں اور کہا۔ "بھیا تم تو لڑکیوں کی طرح زمین پر جھکے جاتے ہو (ہنسکر) مجھے سلام تو کرو میں تمھاری بڑی سالی ہوتی ہوں۔" ساتھ ہی دو اشرفیاں میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ اس کے بعد وہ ذرا دوسری طرف چلی گئیں۔ ان کا بچہ ابھی تک بوٹ کے لئے مچل رہا تھا۔ بڑے بڑے آنسو اس کے دونوں رخساروں پر اب بھی بہہ رہے تھے۔ وہ اسے جا کر بہلانے لگیں۔ "وہ آیا شمّو ننھے کا بوٹ لے کر ابھی شمّو آئے گا۔" میں نے دل میں کہا۔ "اب شمّو آ چکا۔"

کچھ دیر بعد میں باہر جانے کے لئے اٹھا۔ خورشید بولیں۔ "بھائی تم بھی کیا یاد کرو گے کہ پہلے پہل سالی نے پان تک نہ پوچھا۔ (ہنسکر) بات یوں ہوئی۔ کہ آج ہمارا پان لانیوالا چار بجے سے کہیں اللہ کی راہ میں کوچ کر گیا ہے اور ہم اب تک بیٹھے اسکی راہ دیکھتے رہے ذرا دیر ٹھہرو۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا "صبح سہی" اور باہر کی طرف چلا لیکن جان بوجھ کر ذرا قمر کے کمرے کے قریب آ کر رک گیا۔ اندر سے کسی لڑکی کی آواز آئی۔

"اری خدا کی قسم میں نے پہلے بھی کہیں تیرے دولھا کو دیکھا ہے۔"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اب صبح باوجود کئی بار اندر سے بُلاوا آنے کے میں اندر نہ گیا۔ کیونکہ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں دن کی روشنی میں عورتوں کی تیز نگاہیں مجھے پہچان نہ جائیں۔

آخر قمر کی رخصت کا وقت آ پہنچا۔ گھر بھر کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن میرا اور میرے دوستوں کا یہ حال تھا کہ بمشکل اپنے سینوں میں قہقہوں کو روکے ہوئے اس انتظار میں تھے کہ کب موقع ملے اور ہم یہ ہنسی کا خزانہ کھلے طور پر لٹا سکیں راستہ بھر طرح طرح کے لطیفے ہوتے رہے اور آخر ہم اپنے گھر پہنچ گئے وہاں میرے دوستوں کی بیویاں اور کنبہ وغیرہ کی عورتیں پہلے ہی سے جمع تھیں جنہوں نے قمر کا خیر مقدم نہایت مسرت سے کیا۔

دعوت وغیرہ کے بعد جب مہمان رخصت ہوئے۔ تو میں قمر کے زیور وغیرہ کی فہرست جو مرزا صاحب نے دی تھی لیکر بیٹھ گیا۔ اُس سے کہا۔ میں آپکو گنواتا ہوں ذرا دیکھتی جائیے۔ کہ آیا سب زیور ٹھیک ہیں یا نہیں جب ہاتھوں کے زیور کا نام آیا تو قمر شرماتے ہوئے بولی۔ "اس میں ایک کلائی کی گھڑی کم ہوگئی ہے۔ جو میری آپا نے مجھے دی تھی۔ آنے سے ایک دن پیشتر ہمارا ایک ملازم خبیث لیکر معلوم نہیں کہاں چلا گیا۔ شریر بھی بیحد تھا۔ خدا جانے شرارت کیلئے کہیں لیکر نہ بیٹھ رہا ہو۔"

میں نے نہایت متانت سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کہا۔ "لیجئے اپنی گھڑی ذرا دیکھ لیجئے۔ سنار نے ٹانکا وغیرہ تو ٹھیک لگایا ہے یا نہیں؟"

قمر۔ (حیرت کے لہجہ میں) ہیں آپکے پاس کہاں سے آگئی؟

میں۔ (چشمہ آنکھوں سے اتار کر تپائی پر رکھتے ہوئے) وہ خبیث ملازم آپکا ہی خادم تھا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

قمر۔ (غور سے میرے چہرے کی دیکھ کر) میرے اللہ یہ کیا معمّا ہے؟
میں نے تمام واقعات مختصر طور پر اُسے کہہ سنائے۔ وُہ بولی۔ "اُف توبہ، میں کس طرح یقین کروں۔"

آخر جب میں نے چند خاص خاص واقعات جو وہاں گزر چکے تھے بیان کئے تو اُس نے یقین کیا۔ اور بولی۔ "اُف توبہ! آپ بھی کیسے شریر نکلے خدا کی قسم، میں آپکی اس کمبخت "صراحی" والی بات کا خیال ایک دم کے لئے نہیں بھولی۔ اور اسی لئے میں کل سے آپ کے ہاں کی ہر ایک بوتل کو ذرا غور کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔"

اس کے بعد اُس کا اصرار تھا کہ جلد واپس ابا کے ہاں چلو۔ بغیر اس بات کا انتظار کئے کہ مرزا صاحب کے ہاں سے کوئی شخص اُسے لینے کیلئے آئے اب ہم خود ان کی خدمت میں جا رہے ہیں، اور جناب یہی ہے اس عاجز کے "سفر کا اصل مقصد۔"

یہ کہکر شمیم تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ گاڑی ابھی ابھی سٹیشن پر آ کر رُکی۔ عبدالغفار نے دیوانہ وار پلیٹ فارم پر چھلانگ ماری۔ "ارے بھئی کہاں جاتے ہو۔ خدا کے لئے اتنا تو بتاتے جاؤ ——— ..."

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

غم نصیب

"سنتا چیٹرجی"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

سنتا چیٹرجی بی اے

تعارف۔ آپ بابو راما نند چیٹرجی ایڈیٹر ”پرابا سی“ و ”ماڈرن ریویو“ کی صاحبزادی ہیں۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ عام طور پر جو مضامین بنگالی گھروں میں پڑھے جاتے ہیں آپ نے پڑھے۔ اِس کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ ۱۹۱۲ء میں آپ کا زندۂ جاوید افسانہ ”غم نصیب“ بنگالی زبان کے مشہور رسالہ ”پراباسی“ میں شائع ہوا۔

آپکا رجحانِ طبیعت ہمیشہ سماج کی اصلاح کی طرف رہا۔ چنانچہ آپ کے اکثر افسانے پڑھ کر ہمیں احساس ہوتا ہے کہ بڑے بڑے مصلحین اپنی عمر بھر کی لمبی چوڑی تقریروں سے جو خدمت انجام نہ دے سکے۔ وہ آپ نے اپنے قلم کی سحر آفرین جنبش سے انجام دے دی۔ بنگالی ادب میں آپکا درجہ بہت بلند ہے۔

آپ کے افسانے ”غم نصیب“ کا ترجمہ جناب حامد علی خاں صاحب بی۔ اے ایڈیٹر ہمایوں نے کیا ہے۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

مادھوپور کے گاؤں کی آخری حد پر ایک باغ کے وسط میں سنگِ سرخ کی ایک عظیم الشان عمارت سر اُٹھائے کھڑی نظر آتی تھی۔ اس کے بالاخانوں میں جن کے خوبصورت ستون پائے اپنے حُسن پر خود ہی نازاں معلوم ہوتے تھے وقتاً فوقتاً ایک لڑکی دکھائی دیتی۔ علی الصبح جب ایک مشرقی دریچے میں وہ چہرے کو اپنے سفید اور نازک ہاتھوں کا سہارا دیئے کھڑی ہوئی دریا کا نظارہ کیا کرتی تو اُس کا صاف اور پاکیزہ چہرہ شفقِ صبح سے ہلکا گلابی رنگ مستعار لے لیا کرتا۔ اگر میں اُسے صرف لڑکی کہوں۔ تو یہ لفظ اُس کی صحیح تصویر کھینچنے سے قاصر ہے۔ اسکی عمر کا اندازہ کرنا دشوار تھا۔ اُسکی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اپنی گہرائیوں میں صدیوں کا رنج و الم چھپائے ہوئے تھیں اور وہ بڈھوں کی طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی تھی لیکن اُس کا بُوٹا سا نازک قد اُس کی کم سنی کا راز افشا کر دیتا تھا۔

پَو پھٹنے سے قبل جب سکوتِ شب کا طلسم مرغانِ سحر کے اوّلیں نغمے سے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ٹوٹتا۔ سنند آکا قامتِ رعنا و ربا کی طرف جو سرخ عمارت کے قریب ہی بہتا تھا مصروفِ خرام نظر آتا۔ نہانے کے بعد جب وہ واپس آتی تو اس کے بھیگے ہوئے کپڑے اس کے خوبصورت جسم کے ساتھ پیوست ہوتے اور گھاٹ کی ہر سیڑھی پر وہ اپنے گیلے قدموں کا نقش چھوڑتی جاتی۔ اسوقت اس پر سمندر کی کسی دیبی کا گمان ہوتا تھا۔ پانی کے قطرے اُس کے جسم سے ٹپکتے اور گہرہائے نور کی بارش کا سماں باندھ دیتے۔ اور اس کے بھیگے ہوئے بال اس کے سنگِ مرمر کے سے سفید بازوؤں کے ساتھ اِس طرح لپٹے ہوتے۔ گویا کاہی کے پتّے کنول کی شاخوں سے اُلجھ رہے ہیں۔ اس کے ہونٹ گہرے سرخ رنگ کے نہ تھے۔ بلکہ ان کا رنگ بطنِ صدف کی طرح ہلکا گلابی تھا۔ لیکن دنیا اِس راز سے قطعاً واقف نہ تھی کہ سمندر کی اِس ملکہ نے کیوں اپنی پُراسرار آبی مملکت کو چھوڑ کر اس سخت زمین کے ایسے تنہا گوشے کو اپنے غم والم کی یاد کے لئے منتخب کیا۔

یہ قصر دن بھر سنند آکے شیریں زمزموں اور قہقہوں کی گونج سے فردوس گوش بنا رہتا۔ لیکن مسرت کی اِس غازہ بندی کے باوجود اُس کے چہرے کو دیکھ کر بے اختیار نرگس کا ایک تو دمیدہ پھول یاد آجاتا۔ جو سر بسر آنسوؤں میں غرق ہو۔ اس کی ہمجولیاں اُس سے اکثر پوچھتیں "سنندا! ہمیں بھی بتا و ہنسی کا اِتنا بڑا خزانہ تمہیں کہاں سے مِل گیا؟" جس طرح چشمۂ آفتاب ساون کی کالی گھٹاؤں کو چیر کر دفعتہً اُبل پڑتا ہے سنندا مسکرا کر جواب دیتی۔ "مجھے غم کس بات کا ہو؟ نہ میرا کوئی گھر ہے۔ اور نہ کوئی عزیز۔ اسلئے نہ مجھے کسی کی موت کا غم ہے اور نہ میں کسی کے رنج کی شریک ہوں،

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

مجھے کسی سے محبت نہیں۔ اور اِس لئے مجھے کسی کی سرد مہری کا گلہ بھی نہیں
دُنیا بھر سے اجنبیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اجنبیوں کے
لئے آنسو نہیں بہائے جاتے۔ پھر میں کیوں نہ خوش رہوں"؟

وہی باتیں جن سے دوسروں کا دل شدید ترین صدمہ محسوس کرتا،
اُس کے دل کے ساز کا (کم از کم اُس کے قول کے مطابق) کوئی ایسا تار چھیڑ
جاتیں کہ زمزمہ ہائے مسرت کا ایک بے تحاشا سیل امڈ آتا تھا۔

ایک دفعہ کسی ہمجولی نے پوچھا۔ "سنندا کیا تمہارا دل پتھر کا بنا ہے"
اس عجیب لڑکی نے جواب دیا "نہیں میری پیاری، میں بھی تمہاری طرح
گوشت اور خون ہی سے بنی ہوں۔"

لیکن جونہی وہ تنہائی میں جاتی۔ اُس کے چہرے سے تبسم کے آثار
غائب ہو جاتے۔ گویا تبسم کا گرانبہا زیور صرف دکھاوے کے لئے تھا۔ اور
ظاہر ہے کہ جب کوئی دیکھنے والا نہ ہو تو پھر خود آرائی بھی فضول ہے۔

شو دیوتا کا مندر دریا کے کنارے واقع تھا جسطرح آفتاب ہر
صبح طلوع کے وقت مندر کے کلس کو اپنی سنہری کرنوں سے جلا دے کر
جگمگا دیتا۔ اور ہر شام غروب ہونے سے پہلے اپنی آخری آہوں سے مغربی
آسمان میں ایک آگ سی لگا دیتا۔ اسی طرح سنندا نہایت پابندی سے ہر
شام اپنے سفید اور زرتار لباس میں شو دیوتا کی مورت کے سامنے دعا کے
لئے ہاتھ اُٹھائے کھڑی ہوئی دکھائی دیتی۔ مندر کے دیئے کی ہلکی ہلکی روشنی
میں اس کا چہرہ اور بھی سفید نظر آتا۔ اُس وقت وہ اس قدر ساکت و

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

صامت اَور اِس قدر سفید معلوم ہوتی۔ گویا عبودیت اور صدق و صفا کا ایک موم سے ڈھلا ہوا مجسمہ ہے۔ لیکن شام کی عبادت کے بعد جب وہ دیوتا کے سامنے سجدے میں گری ہوئی ہوتی۔ دیکھنے والوں کو یاسمین کا وُہ پھولوں سے لدا ہوا پودا یاد آجاتا۔ جو چھٹکی ہوئی چاندنی میں آسمان کے ستاروں کو شرما رہا ہو۔ اُس وقت کسی شخص کو بھی یقین نہ آسکتا تھا۔ کہ یہ آسمانی حسن اسی زمین پر پیدا ہوا ہے۔ اُس کو دیکھ کر خیال خود بخود بہشت کے کسی پھول کی طرف منتقل ہو جاتا تھا۔ جس کو تند و طوفان خیز ہواؤں نے اِس عالم خاکی میں پھینک دیا ہو۔

موسم سازگار ہو، یا ناساز گار۔ وہ نہ بارش کی پروا کرتی۔ اور نہ طوفان کی۔ اندھیرے اَور اُجالے میں وُہ یکساں عبادت گاہ میں حاضر ہو جاتی۔ اَور ہمیشہ اسی ایک مقام پر اُسی ایک لباس میں کھڑی نظر آتی۔ اُس کے بُشرے پر رنج و راحت دونوں اپنے اثرات کے غلبے کے لئے باہم ایک کشمکش میں مصروف نظر آتے۔ لیکن جب تک وُہ دوسروں کی نگاہوں کے سامنے رہتی۔ تبسم اُس کے چہرے سے کبھی غائب نہ ہوتا۔

(۲)

سنندا کی خوابگاہ میں اس کے سرہانے کی طرف الماری میں سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا ڈبہ پڑا رہتا تھا۔ اُس میں بجز چند بے مصرف چیزوں کے اَور کچھ نہ تھا۔ انہی چیزوں میں ایک خط بھی نظر آتا۔ جو خود اُسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ لیکن اِس کے باوجود وہ اُسے بہت عزیز رکھتی تھی۔ سرنامے پر

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کسی کا نام نہ تھا۔ اس لئے سرسری نظر سے مکتوب الیہ کا سراغ ملنے کی کوئی بھی صورت نہ تھی۔ لیکن خط کے مضمون سے اس کا نام معلوم ہو جاتا تھا۔ بلکہ اس سے راقمۂ خط کے متعلق بھی بہت سی ایسی باتیں ظاہر ہو جاتی تھیں۔ جو بصورتِ دیگر ہمیشہ پردہ اخفا میں رہتیں۔ خط کا مضمون اس طرح شروع ہوتا تھا۔

" ہر انسان خواہ مرد ہو خواہ عورت کسی ایسی چیز کا مالک ہوتا ہے۔ جسے وہ کسی قیمت پر الگ نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ اسکی ملکیت میں اور کسی شخص کی شرکت بھی گوارا نہیں کرتا کہ مبادا اس سے اس چیز کی بے قدری ہو ـــــ میرے پاس بھی ایک ایسی ہی چیز ہے۔ اور وہ میرا غم ہے۔ میں کسی کو بھی اپنا شریک غم بنانا نہیں چاہتی۔ میرے پاس اور کوئی چیز ایسی نہیں۔ جس کی ملکیت اس قدر صحیح طور پر میری ذات خاص سے وابستہ ہو کہ میں کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اس کی جدائی گوارا کر سکوں ـــــ اسے دیوانہ وار چاہوں۔ اور اپنے نہاں خانۂ دل کے عمیق ترین گوشوں میں چھپائے رکھوں۔ لیکن ایک وقت آئے گا جب میں نہ رہونگی۔ اس وقت میں اپنی اس امانت کو جو مجھے جان سے بھی عزیز ہے تمہارے سپرد کر دینا چاہتی ہوں۔ میں کسی اور کو اس کا امین نہیں بنا سکتی۔ خدا نے اپنے ہاتھوں میرے دل کو اس امانت کا گنجینہ دار بنایا۔ اور کوئی متنفس اس راز سے واقف نہ ہو سکا۔ میں نے آج تک اس امانت میں خیانت نہیں کی۔ میں غم کی اس متاعِ عزیز کو ہنسی کے پردے میں اس طرح چھپائے رکھتی ہوں۔ جس طرح سبز گھاس

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

زمین کے اندرونی خزانوں کو ڈھانکے رہتی ہے۔ تم نے جب کبھی میرے چہرے کو دیکھا۔ اُس پر ہنسی کی نقاب پڑی رہتی ہے۔ اِس لئے ممکن ہے کہ تمہیں اِس آنسوؤں کی کہانی کا یقین نہ آئے۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے دنیا مسرت سے اُس کا خیر مقدم کرتی ہے۔ لیکن میں جس دُنیا میں پیدا ہوئی۔ اُس میں میرے خیر مقدم کا کوئی بھی سامان نہ ہوا جس ایک متنفس نے مجھے اپنی آغوش میں لیا۔ اُس کی آنکھوں میں بھی آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میری دنیا میری ماں کی گود تھی۔ اور اسی کی محبت کا رشتہ مجھے اِس دنیا سے وابستہ کئے ہوئے تھا۔ بچوں کی دُنیا ہوا خواہوں اور شفقت کرنے والوں سے بھری ہوتی ہے۔ کوئی خون کے جوش سے مجبور ہوتا ہے اور کسی کو دل کا تعلق کھینچ لاتا ہے۔ دُنیا بچوں کی درمِ ناخرید غلام ہوتی ہے۔ اُس شخص سے زیادہ بدبخت کوئی نہیں ہوتا جس پر کسی بچے کی نرم و نازک ننھی ننھی انگلیاں حکمرانی نہ کرتی ہوں۔ لیکن میرے پیدا ہوتے ہی دُنیا نے اپنے سالخوردہ چہرے پر بل ڈال لئے۔ مجھے مطلق علم نہ ہوا کہ خون کے تعلق نے مجھے کس سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اور جذبِ محبت بھی کسی کو میرے پاس نہ لایا۔ بے زبان فطرت ہی میری تنہا رفیق تھی۔ اور میں انسانی جذبات کے مدوجزر سے قطعاً ناآشنا تھی۔

میرے دل پر بچپن کی یاد کے نہایت مبہم اور دھندلے سے نقوش باقی ہیں بچپن کے کسی رفیق کی یاد۔ یا اُس زمانے کے واقعات جو ان نقوش کو آب و رنگ دیکر زیادہ نمایاں اور روشن کر دیں۔ میرے ذہن سے بالکل اتر

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

چکے ہیں۔ ان دنوں کی یاد میری چشم تصوّر کے سامنے صرف ایک تصویر کھینچ لاتی ہے۔ اور وُہ میری ماں کی صورت ہے۔

میری لوحِ زندگی کا وُہ سب سے پہلا نقش جو کچھ زیادہ روشن اور نمایاں ہے۔ بجز گریہ و اشک کے اور کچھ نہیں۔ میں اپنی ماں کے گلے سے چمٹی ہوئی تھی۔ میرا سر اُس کے کندھے پر تھا اور روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے۔ اور اُس کا اشک آلود چہرہ شبنم میں ڈوبے ہوئے کنول کے سفید پھول کی طرح تھا۔ میری ماں کے قریب ایک معمر شخص کھڑا تھا۔ لمبے لمبے بال جو سمندر کی طرح سفید تھے۔ اُس کے شریفانہ چہرے کے گرد ہالہ کھینچے ہوئے تھے۔ میری ماں اُس سے کہہ رہی تھی "میں اس بدقسمت بچی کو آپ کے حوالے کرتی ہوں، آہ کس قدر بدنصیب ماں ہوں کہ کسی صورت اپنی بچی کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتی"۔ بڈھے آدمی نے مجھے لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے لیکن میں اپنی ماں کے ساتھ زیادہ زور سے چمٹ گئی۔ اُس کے آنسو میرے بالوں کو بھگو رہے تھے۔ میں اس سے پہلے تمہیں بتا چکی ہوں کہ اس وقت میری دنیا میری ماں کی گود تھی۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ دُنیا رو رو کر مجھ سے رخصت ہو رہی ہے۔ بڈھے آدمی کے ہاتھ مجھے پھسلانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ میں اُس کو مشتبہ نظر دل سے دیکھتی تھی۔ میں اُس وقت یہ سمجھنے سے تو قاصر تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے لیکن اپنی ماں کے آنسوؤں کو دیکھ کر مجھے کسی خوفناک انجام کا آغاز نظر آ رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ رونے دھونے کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہا۔ لیکن اتنا یاد ہے۔ کہ آخر

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

جب بڈھے کے سخت گیر ہاتھوں نے مجھے میری ماں کی گود سے چھین لیا۔ رات کی تاریکی پھیل چکی تھی اور ہر طرف خاموشی چھا رہی تھی۔ میری ماں جلدی سے دروازے کی طرف لپکی۔ اس سے قبل کہ اُس کے پائے ثبات میں لغزش آتی۔ یا اُس کا عزم متزلزل ہوتا وہ مجھ سے جدا ہو جانا چاہتی تھی۔ دروازے میں پہنچکر اُس نے مجھ پر ایک نگاہِ واپسیں ڈالی اور چند مجہول الصوت دعائیہ الفاظ کہے۔ اِس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے میری آنکھوں سے غائب ہوگئی۔

اُس دن میں نے اپنی ماں کو آخری مرتبہ دیکھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کون تھی، اُس کے آخری الفاظ میں بالکل بھول چکی ہوں۔ ہاں وہ آنسو مجھے یاد ہیں جو رخصت کے وقت جب وہ میرا منہ چوم رہی تھی میرے بالوں پر گر رہے تھے، دنیا بھر میں وہ ایک متنفس جس پر مجھے کسی قسم کا دعویٰ تھا۔ میری ماں تھی اور وہ ایک چیز جو اس کی طرف سے مجھے ترکے میں ملی اس کے آنسو تھے۔ اسی گراں بہا خزانے کو میں اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھی اور زمانہ اس میں آج تک پیہم اضافہ کرتا رہا ہے۔

میں محبت بھرا دِل لیکر پیدا ہوئی لیکن میں نے اُسے جس سے میں قدرتاً محبت کر سکتی تھی۔ اپنی صبح زندگی ہی میں اُس ستارے کی طرح کھو دیا۔ جو طلوع آفتاب کے وقت نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ میں سمجھ گئی کہ زندگی میں میرے لئے آنسو مقدر ہو چکے ہیں۔ محبت کا لطف اور مسرت کے قہقہے میری قسمت میں نہیں۔ لیکن مجھے قدرت کا یہ فیصلہ بہت گراں گزرا۔ میں اپنے خالق سے رُوگرداں ہوگئی اور میں نے اُس کے فیصلے کے خلاف بغاوت کا عزم

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کر لیا۔ میں نے اسی دن آنسوؤں کو اپنی آنکھوں سے رخصت کر دیا۔ جب میرا سنگین مزاج محسن مجھے میری ماں کی گود سے چھین کر اپنے گھر میں لایا۔

اپنے نئے گھر میں پہلے چند دِنوں تک میں بالکل چپ سادھے رہی میں اُس بستر سے نہ اٹھتی تھی جس پر اپنی ماں کی گود سے جدا ہونے کے بعد میں نے پناہ لی تھی۔ میں نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ بوڑھا آدمی میرے اِس طرزِ عمل کو صبر تحمل سے برداشت کرتا تھا۔ وُہ مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانے کے لیے آتا لیکن میں طیش میں آ کر اُس کا ہاتھ پرے جھٹک دیتی اَور اپنا منہ نہ کھولتی۔ میں اپنے ہونٹ اپنے دانتوں میں زور سے دبالیتی کہ میری خواہش کے خلاف کہیں کھل نہ جائیں وُہ میرا کھانا لیے پہروں انتظار کرتا، یہاں تک کہ بعض اوقات شام ہو جاتی۔ وہ خود بھی اس خیال سے بھوکا رہتا۔ کہ جو بچی اُسکے سپرد کیگئی ہے۔ اُس نے کچھ نہیں کھایا۔

اپنی خردسال مہمان کی رضا جوئی کیلئے اُس نے ہر کوشش صرف کی رفتہ رفتہ میرا کمرہ کھلونوں کی ایک دکان کی صورت اختیار کرنے لگا۔ باغ کی تمام مسرت میری خوشی کیلئے لُوٹ لی جاتی تھی۔ میں ہر وقت چھوٹے چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں میں گھری رہتی۔ شریف النفس بُڈھا میرا دل بہلانے کے لئے اُنہیں لالچ دے دیکر بلاتا۔ چونکہ مجھے کبھی رفیق کی صحبت میسر نہ ہوئی تھی۔ میں نے حریصانہ اشتیاق سے اُن کا خیر مقدم کیا۔ اب میرے محسن کو اطمینان نصیب ہوا اَور تبسم پھر میرے لبوں پر کھیلنے لگا۔

رفتہ رفتہ وُہ سنسان اَور پرانا مکان مجھے اپنا گھر معلوم ہونے لگا۔ اب میں

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

بڑھے آدمی کو دادا جان کہکر پکارنے لگی۔ وُہ مجھے سنندا کہا کرتا تھا مجھے اپنا یہی نام یاد ہے۔

جب میں ذرا بڑی ہوئی دادا جان نے مجھے شِو دیوتا کی پرستش کا طریقہ سکھایا میری روح کو اس سے انتہائی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ دادا جان نے مجھے بتایا کہ دیوتا کے سامنے ہم اپنی دلی تمناؤں کا اظہار کر سکتے ہیں۔ وہ ہر بات پر قادر ہے۔ وُہ بڑے سے بڑے رنج کو راحت سے بدل سکتا ہے۔ میں نے دادا جان کی باتوں پر مضطربانہ شوق کے ساتھ اعتبار کر لیا۔ ہر شام اپنا سر نیاز خم کئے ہوئے میں دیوتا کے سامنے اپنے دِلی جذبات کا اظہار کیا کرتی۔ لیکن میں نے کبھی کسی انسان کو ان باتوں سے واقف ہونے کا موقع نہ دیا۔ میں لوگوں کو اس قابل ہی نہ سمجھتی تھی۔ وہ صرف میرے تبسم سے آشنا تھے۔ لیکن آنسوؤں کے اُس سمندر کا حال جسے میں اپنا دل کہتی ہوں صرف میرے معبود کو معلوم تھا۔

میں دادا جان کے گھر میں نازونعمت سے پرورش پا رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں یہ بات کبھی نہ بھول سکی کہ مجھ میں اور دوسرے بچوں میں ایک بہت بڑا فرق تھا۔ بچپن کے دنوں میں جب میں خود اپنا کام کرنے سے معذور تھی۔ دادا جان مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتے تھے۔ اور اپنے ہاتھ سے نہلاتے لیکن اس کے باوجود عبادت سے پہلے اگر کبھی میں اُن سے چھو جاتی تو کڑکتے جاڑوں میں بھی دوبارہ غسل کر لیا کرتے اور اپنے اس طرزِ عمل کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کرتے۔ تاکہ میری خودداری کو صدمہ نہ پہنچے۔ لیکن مجھے فریب دینا محال تھا ـــــ جسے زندگی کے تلخ تجربوں نے اُس حسنِ ظن سے محروم

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کر دیا تھا جو محبت ہر بچے کے دل میں پیدا کر دیتی ہے۔ جب کبھی میں انہیں اس حالت میں دیکھ پاتی وہ مجھ سے آنکھیں چُراتے اور کتر اکر نکل جاتے تا کہ کہیں ان کے اس طرزِ عمل کے متعلق میں ان سے کوئی سوال نہ کر بیٹھوں۔ لیکن مجھ بد نصیب کو کسی انسان سے کسی قسم کا گلہ کرنے کا کیا حق حاصل تھا۔ میں اپنا دکھڑا اُسی کے سامنے روتی تھی جس نے مجھے پیدا کیا تھا۔ دادا جان کے سامنے میں ہمیشہ ہنستی کھیلتی رہتی اور اُن کے اطمینان کے لئے انہیں ذرا بھی معلوم نہ ہونے دیتی کہ میں کسی بات سے واقف ہوں۔ میرے متعلق لوگ اُن سے مختلف سوال کیا کرتے تھے۔ لیکن وہ میری موجودگی میں کبھی ان سوالوں کا جواب نہ دے سکتے تھے۔ میں خود دادا جان کو اس کشمکش سے نجات دلانے کیلئے لوگوں کا جواب دے دیا کرتی کہ میں ان کی منہ بولی پوتی ہوں۔

دادا جان بڑھاپے کے باعث روز بروز اس دُنیا سے دُور۔ اور اُس دُنیا کے نزدیک پہنچ رہے تھے۔ دن مہینے اور سال آنکھوں آنکھوں میں گزر گئے۔ آخر ایک دن انہوں نے کہا۔ "ہم بادھو پور جا رہے ہیں"۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے مکان کو ہی اپنا آخری مسکن بنائیں۔ چنانچہ ہم اس سرخ عمارت میں پہنچے۔ باغ کے درخت برگ و بار سے لدے کھڑے تھے۔ اور موسم بہار کی آمد کا پیغام دے رہے تھے۔ ہمارا مکان بالکل غیر آباد اور سنسان تھا۔ میں نے سنا ہے کسی زمانے میں یہاں بہت سے لوگ رہتے تھے۔ اور بہت پُر رونق محفلیں رہا کرتی تھیں۔ لیکن اب وہ باتیں خواب و خیال ہو چکی تھیں۔ ہاں پوجا کے وقت شوجی کے مندر میں اب بھی خوب چہل پہل ہو جایا کرتی تھی۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

دادا جان کسی زمانے میں بہت امیر تھے۔ آرام و آسائش کے تمام سامان مہیا تھے۔ خدا نے اولاد بھی دے رکھی تھی۔ لیکن دولت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے جس طرح اس نے وفا نہ کی اُسی طرح اولاد بھی ایک ایک کر کے اس دنیا سے رخصت ہوئی۔ ہاں ایک پوتا تھا جو اجل کی دستبرد سے بچ گیا۔ لیکن شدید غم کی حالت میں دادا جان نے نہ صرف اپنے وطن کو خیرآباد کہی بلکہ اپنے پوتے سے بھی علیحدگی اختیار کر لی۔

وُہ اس بیوفا اور ناپائدار دُنیا سے ہر قسم کا تعلق توڑ لینا چاہتے تھے لیکن اپنے آخری دن گزارنے کیلئے انہوں نے اپنے اس پرانے ویران گھر ہی کو منتخب کیا۔ وُہ کہا کرتے تھے' اسی مقام پر میری زندگی کے سب رفیق مجھ سے بچھڑ گئے۔ کم از کم موت کے بعد تو میں ان سے جدا نہ ہوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری خاک بھی ان ہی کی خاک میں مل جائے۔

اسی جگہ میں تم سے پہلے پہل ملی۔ اور میرا تاریک دل تمہاری صورت دیکھتے ہی نورِ مسرت سے جگمگا اٹھا۔ اس بات کو اب ایک زمانہ گزر چکا ہے شاید وُہ دن تمہیں یاد نہ رہا ہو۔

میرا خیال ہے کہ جب یہ سیڑھیاں بنی ہونگی جن سے اتر کر ہم دریا کی طرف جاتے ہیں تو دریا تمہارے مکان کے قریب بہتا ہوگا۔ اور پانی کی لہریں آآ کر دیواروں سے ٹکراتی ہوں گی۔

اب دریا کا رُخ کچھ بدل چکا ہے اور دریا تک پہنچنے کے لئے زینے سے اُتر کر چند قدم کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ ذرا آگے برگد کا ایک بہت

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

بڑا پُرانا درخت معلوم نہیں کب سے کھڑا سامنے نیلے پانی میں اپنا عکس دیکھ رہا ہے۔ پانی کی رَو اس کی جڑوں پر سے مٹی بہا کر لے گئی ہے۔ اس درخت کے نیچے دو بڑے بڑے پتھر رکھے ہیں۔ اب یہ جگہ گاؤں والوں کے نہانے کا گھاٹ بن چکی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اُس دن صبح کے وقت میں گھر سے نکل کر ان پتھروں میں سے ایک پر بیٹھی تھی۔ دریا خاموش میرے سامنے بہہ رہا تھا۔ اور ابھی اسکی سطح سورج کے بوسوں سے سرخ نہ ہوئی تھی۔ پرندے دن کے خیر مقدم کیلئے چہچہا رہے تھے۔ ان کے شیریں نغموں نے فضا میں ایک گونج پیدا کر رکھی تھی۔ اور میں اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ دُنیا میں میرا کوئی عزیز زندہ ہے۔ یا نہیں۔ اور وُہ جس کی آغوش میں قسمت نے مجھے پناہ دے رکھی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہا تھا۔ اسی وقت میں نے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنی۔ اور میری نظر اوپر کی طرف اٹھی۔ تم دھیرے دھیرے دریا کی طرف آ رہے تھے۔ اُسی وقت آفتاب نے مشرقی افق سے اپنا سر نکالا۔ لیکن تمہاری صورت کو دیکھتے ہی میرے دل میں ایک اور آفتاب کی نمود ہوئی۔ جو دنیا کے آفتاب سے کہیں زیادہ روشن اور کہیں زیادہ دلکش تھا۔ صبح کی پیاری پیاری روشنی میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا یہ لمحہ میری زندگی کا سب سے زیادہ مبارک اور اس کے ساتھ ہی سب سے زیادہ نامبارک لمحہ تھا۔

انسان کا دل فطرتاً رفاقت کا بھوکا ہوتا ہے۔ اور چونکہ انتخاب میرے اور دادا جان کے درمیان تھا۔ کیا تعجب ہے جو تم نے رفاقت کے لیے اپنی ہمعمر

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کو منتخب کیا ہو۔ اور اسی طرح میں نے تمہیں اپنا رفیق بنا لیا۔ میرا مجازی تبسم اُس زمانے میں حقیقی بن گیا۔ اور جب تک مجھے تمہاری رفاقت میسر رہی۔ میں نے اپنے غم کو اپنے دل سے رخصت کیے رکھا۔ ان دنوں مجھے تمام دنیا مسرت کے نور سے منور نظر آتی تھی۔ آہ وہ دن کس طرح گزر گئے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ ایک خواب تھا۔ جو دن کی تیز اور ناگوار روشنی کی تاب نہ لا سکا اور معدوم ہو گیا۔ ہاں اس زمانے کی یاد خواب کی کسی پری کے سنہرے پر کی طرح جو اس کے پھڑپھڑاتے ہوئے بازوؤں سے جھڑ گیا ہو دل میں ابھی تک باقی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں اُنہی چند دنوں میں اپنی عمر بھر کی سیاہ بختیوں کی تلافی کر لینا چاہتی تھی۔ میری زندگی کا ساز ان دنوں مسرت کے بلند اور روح پرور نغموں کا گہوارہ بن رہا تھا۔ لیکن شاید جذبۂ شوق سے بے اختیار ہو کر میں نے اس ساز کو اس زور سے چھیڑا کہ ایک دن اُس کا تار ٹوٹ گیا۔ اور اُس دن سے یہ ساز خاموش پڑا ہے۔

اُنہی دنوں جب ہماری زندگی کا ہر لمحہ حقیقی مسرت سے لبریز رہتا تھا ہمارے گھر میں موت کا پیغامبر داخل ہوا۔ دادا جان دفعتہً علیل ہو کر بستر مرگ پر پڑ گئے میرا تمام دن تو ہنسی خوشی میں گزر جاتا تھا۔ لیکن صبح اور شام دو دفعہ میں ضرور ان کے کمرے میں جاتی اور ان کے پاس بیٹھا کرتی تھی۔ وہ میری طرف رحم اور محبت کی نظروں سے دیکھتے اور اپنے کانپتے ہوئے شفیق ہاتھوں سے میرے بالوں کو سلجھاتے۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کا دل میرے لیے متفکر ہے۔ وہ سوچتے تھے کہ جس لاوارث لڑکی کو میں نے اتنا عرصہ اپنے پاس پناہ دیئے رکھی۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اب بالکل کس مپرس رہ جائیگی۔ یہ روح فرسا فکر ان کی موت کو روز بروز قریب تر لا رہی تھی۔ محبت اور شرافت میں ان کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود انہیں بھی مجھ سے چھونے کے بعد طہارت کے لیئے نہانا پڑتا تھا پھر مجھے کسی اور سے کس بات کی امید ہو سکتی تھی۔

لیکن یہ خیالات بعد میں پیدا ہوئے۔ ان دلوں اس قسم کی دردانگیز باتوں کیلئے میرے دل میں گنجائش ہی نہ تھی۔ دادا جان کبھی کبھی مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کرتے مگر کہہ نہ سکتے تھے۔ لیکن جو کچھ ان کی زبان نہ کہہ سکتی تھی۔ اُن کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے ہزاروں مروتیں کی تھیں اور اب وُہ مجھ سے ایک مروت کے خواستگار معلوم ہوتے تھے۔ لیکن میں نے یہ سمجھنے کی کوشش بھی نہ کی کہ وُہ مروت کیا ہے۔ اس زمانے میں ایک بوڑھے آدمی کی دھندلی اور اشک آلود آنکھوں کی زبان سمجھنے کے لیئے میرے پاس وقت نہ تھا۔

تمہاری سیاہ اور روشن آنکھیں ہر صبح مجھے ایک نئی داستان سناتی تھیں اور میری آنکھیں بجز اس کے اور کچھ بھی نہ چاہتی تھیں۔ میں جلد جلد چند الفاظ کہکر مسکراتی ہوئی دادا جان کے کمرے سے چلی آتی۔ ایک ٹوٹے ہوئے دل کی بے شمار آہیں میرا تعاقب کرتیں۔ لیکن میں کچھ خیال نہ کرتی۔ بلکہ مجھے ان کا احساس بھی نہ ہوتا۔ ان باتوں کے سوچنے کا موقع تو مجھے اب ملا ہے۔

تمہیں وُہ دن یاد ہے۔ جب ہم نے دریا کے کنارے سبزے کے خوشنما فرش پر بیٹھ کر کنول کے پھولوں کا ایک بہت بڑا ہار تیار کیا تھا۔ ہار کے دھاگے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کا ایک سِرا تمہارے ہاتھ میں تھا۔ اور دوسرا میرے ہاتھ میں، اور ہم دونوں ایک ساتھ پھول پرو رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ہمارے ہاتھوں میں ایک بہت لمبی زنجیر بن گئی تھی۔ جس کے درمیان کنول کا ایک بہت ٹرا تر و تازہ پھول تھا۔ دادا جان کو کنول کے پھولوں سے خاص دل بستگی تھی۔ اسلئے میں وُہ ہار اٹھا کر ان کے پاس لے گئی۔ میں نے چلا کر کہا۔" دادا جان دیکھیے کتنا خوبصورت ہار ہے۔ جب میں اسے پہنتی ہوں تو یہ میرے قدموں تک پہنچ جاتا ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔" ہاں سنندا تم تو پھولوں سے اس قدر لد گئی ہو۔ کہ تم پر سوتی دیوی کا گمان ہوتا ہے۔ تمہیں اتنے پھول کس نے دیئے ہیں؟"

میں نے تمہارا نام لیا۔ اس وقت ان کے زرد چہرے کا رنگ اور زیادہ زرد ہو گیا۔ لیکن اُنہوں نے مسکرا کر کہا۔" میری پیاری بچی! تم اپنے دن صرف ہنسی اور کھیل میں گزار رہی ہو۔ لیکن یاد رکھو کہ زندگی میں ہنسی کے قہقہوں کے ساتھ غم کے آنسو بھی ہوتے ہیں۔ انسان کو دونو کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ ورنہ غم زیادہ اذیت کا باعث ہوتا ہے۔ خدا کرے تمہاری قسمت میں غم نہ ہو لیکن کیا معلوم پردۂ غیب میں کیا ہے۔

میں نے ہار دیوار کے ساتھ لٹکا دیا۔ اور خاموش باہر چلی آئی۔ ہمارے پُرمسرت قہقہوں نے بیمار کے کمرے میں پہنچکر بھی اپنی داستان سنا دی تھی۔ لیکن وہاں سے اُنہیں جواب میں بجز حسرت و یاس اور کچھ نہ مل سکتا تھا۔

میں نے وُہ تمام دن خاموشی اور تنہائی میں گزارا۔ میرے سر پر کسی آنے والی مصیبت کا تاریک بادل چھا گیا۔ لیکن میں حیران تھی۔ کہ یہ مصیبت کس

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

صورت میں آئیگی۔ مجھے بوڑھے دادا نے آنسوؤں کے لئے تیار رہنے کی نصیحت کی تھی۔ مگر کیوں؟ مجھے خیال آیا شاید تم نے میرے خلاف ان سے کچھ کہا ہو لیکن یہ خیال میرے دل میں نہ ٹھہر سکا۔ میں نے تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچائی تھی، پھر کیوں تم ایسا کرتے۔ میں نے سوچا شاید میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے اور دادا جان مجھے اُس کی موت کی خبر سنانے کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ جب میں نے اُسے آخری دفعہ دیکھا تھا اُس وقت میں بالکل ایک نادان بچی تھی۔ میں اپنے تصور کی آنکھوں کے سامنے اُس کے اشک بھرے چہرے کی تصویر کھینچتی لیکن میری آنکھیں پُرنم نہ ہوتیں۔ میں ایک ایسی ماں کے لئے کیوں روتی جس نے خود مجھ سے منہ پھیر لیا تھا۔ گلی گلی بھیک مانگنے والے گدا بھی اپنے بچوں کو اپنی عُسرت میں شریک رکھتے ہیں۔ لیکن میری ماں سے اتنا بھی نہ ہو سکا۔ میں نے اپنا دل کڑا کر لیا۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ کسی کے لئے روتی یا کڑھتی آخر میں نے یہ اندوہناک خیالات اپنے دل سے بالکل نکال دیئے۔

لیکن پھر بھی اُس دن سے خوشی میرے دل سے رخصت ہو گئی۔ اور سستی و افسردگی نے مجھ پر قابو پا لیا۔ میں نے گھر سے باہر جانا چھوڑ دیا اور اپنے وقت کو فضول اور بے سود کاموں میں گزارنے لگی۔ تم میرے اس طرزِ عمل سے پریشان نظر آتے تھے۔ اور مجھ سے اس کا سبب دریافت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن میں ہنس کر ٹال دیتی تھی۔ آہ یہ ہنسی بھی روز بروز جھوٹی اور بے کیف ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ دن اسی طرح گزر گئے۔ آخر ایک دن تم صبح کے وقت دادا جان کے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کمرے میں داخل ہوئے۔ اور دو یا تین گھنٹے تک بیٹھے رہے۔ مجھے معلوم نہیں تم نے آپس میں کیا گفتگو کی۔ لیکن جس وقت تم باہر نکلے۔ اسی وقت میں اندر بلائی گئی۔ جب میں کمرے میں داخل ہوئی۔ دادا جان نے مجھ سے کہا۔ "میری بچی! میری عمر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ میں اس دنیا سے رخصت ہوں۔ میں تم سے اور شنکر سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اُسے میں سب کچھ سمجھا چکا ہوں۔ لیکن میری پیاری بچی! مجھے تمہارا زیادہ خیال ہے۔"

اس کے بعد کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہو گئے۔ اور بغور میری طرف دیکھنے لگے۔ میں منہ پھیرے بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ اور میرا دل دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے پھر کہا "سنندا! شاید تمہیں معلوم نہ ہو کہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے۔ تم مجھے میرے پوتے شنکر کی طرح عزیز ہو۔ جب میں نے یہ گھر چھوڑا تھا۔ میں نے اپنے دل سے عہد کر لیا تھا کہ آئندہ اس دنیا سے تمام تعلقات منقطع کر لوں گا۔ محبت اننت دکھ کا پھوٹتا سوتا ہے۔ اس دنیا میں آئندہ کسی سے دل نہ لگاؤں گا۔ لیکن تمہاری پیاری صورت دیکھتے ہی میرا یہ عہد ٹوٹ گیا۔ انسان کا دل کبھی دیر تک خالی نہیں رہ سکتا۔ کوئی نہ کوئی چپکے سے اس میں اپنی راہ نکال لیتا ہے۔ اور اس میں داخل ہو کر حکمرانی کرنے لگتا ہے۔ قدرت کا قانون ہی یہی ہے۔ تم بھی اسی طرح میرے دل میں داخل ہو گئیں۔ اور اسکی ننھی ملکہ بنیں۔ شنکر ان دنوں اپنے ننہال میں تھا۔ میں نے خود اسے وہاں چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ مجھے اس دنیا سے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ہر قسم کا رشتہ توڑ لینے کی آرزو تھی۔ لیکن محبت کا دام چپے چپے پر بچھا ہوا ہے میں اس سے کس طرح بچ سکتا تھا۔ چنانچہ جس محبت اور جانکاہی سے میں نے تمہیں پالا ہے۔ اس سے تم بھی واقف ہو۔ تمہیں دُکھ درد اور گناہ سے بچانے کے لئے جہاں تک مجھ سے ہو سکا۔ میں نے کوشش کی۔ لیکن آہ تقدیر کسی کے بس کی نہیں۔ قسمت میں یہی لکھا تھا کہ دنیا میں سب سے پہلا دُکھ بھی تمہیں مجھی سے پہنچے۔ میں یہ بات ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب اس کے سوا چارہ بھی نہیں۔

میں چپ چاپ سنتی رہی۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ جو کچھ میں نے سُنا اُس سے مجھ پر خوف و ہراس چھا گیا۔ میں نہ جانتی تھی گناہ کیا ہے۔ لیکن اتنا میں جان گئی۔ کہ میری پیدائش کسی گناہ کا نتیجہ ہے۔ اب میں سمجھی کہ میری ماں نے کیوں اپنی بچی کو چھوڑا تھا۔ وہ مجھے اپنی آلودگی سے بچانا چاہتی تھی۔ اُس نے اسی خیال سے مجھے اس پاک منش انسان کے سپرد کیا تھا۔ کہ اُس کی پارسائی شاید میرے گناہ کو بھی دھو ڈالے۔ لیکن کبھی کوئلہ بھی دھونے سے سفید ہوا ہے۔ پھر میری پیدائش کی معصیت کا داغ کیوں چھوٹتا؟

دادا جان نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میری بچی! میں نے تمہیں جان سے عزیز رکھا ہے۔ مگر انسان خطاؤں کا پُتلا ہے۔ ممکن ہے۔ بعض دفعہ میرے طرزِ عمل سے تمہیں رنج بھی پہنچا ہو۔ با ایں ہمہ میں تم سے ہمیشہ اپنی اولاد کی طرح محبت کرتا رہا۔ اور اب جب کہ میں اس دنیا سے رخصت ہونے

کو ہوں۔ تم سے صرف ایک عنایت کی التجا کرتا ہوں۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو لیکن مجھے مدت سے معلوم ہے۔ کہ تم شنکر کی آنکھوں کا تارا ہو۔ میری پیاری بچی! آج اُس نے میرے سامنے اِس بات کا اقرار بھی کر لیا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں۔ کہ تم گنگا کے پانی کی طرح پاک اور بے لوث ہو۔ لیکن ظالم دُنیا کا رواج اِسے نہیں مانتا۔ اُس کے قانون کے مطابق تمہاری حیثیت ایک اچھوت کی سی ہے۔ میری پیاری بچی! میرے سفید بالوں پر ہاتھ رکھکر مجھ سے وعدہ کرو کہ تمہارا وجود شنکر کو اُس کے ہمچشموں میں ذلیل کرنے کا باعث نہ ہوگا۔ اور تم میرے خاندان کے اس آخری فرد کو اس کی شان کے شایاں عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دوگی۔ اگر تم اُس سے سنگدلی اور بیرُخی کا برتاؤ کروگی تو وہ بھی تمھاری یاد اپنے دل سے محو کر دیگا۔ بے اعتنائی رفتہ رفتہ محبت کو مٹا دیتی ہے۔ انسان کی فطرت یہی ہے۔ میرے بعد تم آرام و اطمینان سے زندگی گزار سکوگی۔ کیونکہ تم میری جائداد کی وارث ہوگی"۔

جائداد کا ذکر سن کر مجھے یوں معلوم ہوا کہ گویا کسی نے میرے دل میں سینکڑوں سوئیاں چبھو دی ہیں، لیکن میں نے دادا جان کی خواہش کے مطابق بے چون وچرا وہ حلف اٹھا لیا۔ مجھے اُس وقت محسوس ہوا۔ کہ میں نے کتنا بڑا بوجھ اٹھا لیا ہے۔

اِس کے بعد میں کمرے سے باہر چلی آئی۔ مگر اس تھوڑے سے عرصے میں ایک انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔ چند لمحے قبل ایک لڑکی اس کمرے میں داخل ہوئی تھی مگر اس گفتگو کے بعد ایک عورت باہر نکلی۔ مجھے اُس وقت

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

معلوم ہوا کہ میں بے خبری ہی بے خبری میں اپنا سب کچھ تم پر نثار کر چکی تھی۔ دُنیا کی کوئی چیز مجھے تم سے زیادہ عزیز نہ تھی۔ اس لئے میں بھول جانا چاہتی تھی۔ لیکن دِل کس کے اختیار میں ہے۔ مسرت کے دنوں میں تم میرے رفیق تھے۔ لیکن غم کے دِنوں میں میرے دِل کی کل کائنات تم ہی تم ہو گئے۔ میں تو تمہیں بھول نہ سکتی تھی۔ البتہ میری کوشش یہ تھی۔ کہ تم رفتہ رفتہ مجھے بھول جاؤ۔

آہستہ آہستہ میں تم سے الگ الگ رہنے لگی۔ میں تمھاری باتوں کا جواب بے اعتنائی سے دیتی۔ اور تم پر یہ ظاہر کرتی۔ گویا مجھے گھر کے کام سے ایک لمحہ کی فرصت بھی نہیں ملتی۔ کہ اپنے وقت کو بچوں کی سی باتوں میں ضائع کرسکوں۔ بلکہ میں اپنے دِل کو بھی یہی یقین دلاتی کہ تمہاری حیثیت میرے لئے محض ایک شناسائی سی ہے۔

اس وقت تک میں نے تم سے کبھی تمھاری شادی کا ذکر نہ کیا تھا۔ لیکن اب میں تم سے عموماً تمہاری شادی اور تمہاری بیوی کے متعلق سوالات کی چھیڑ چھاڑ کیا کرتی۔ اور جس قدر یہ باتیں تمہیں زیادہ ناگوار گزرتیں اسی قدر میں ان کا زیادہ ذکر کرتی۔ میرا مقصد ہی یہی تھا۔ اُس دِن پوس کے مہینے کی آخری تاریخ تھی۔ جب تم نے پھولوں کا ایک ہار لاکر مجھے دیا۔ تم کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن میں تمہاری بات کاٹ کر بولی۔ "تم کیسے نادان ہو۔ اور کیسی فضول باتوں میں لگے رہتے ہو۔ میں تمہارے پھولوں کو کیا کروں۔ یہ پھول اُسے دو جس کے دِل میں ان کی قدر ہو۔"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

تم نے مجھ پر ایک درد بھری نگاہ ڈالی۔ تمہیں مجھ سے ان الفاظ کی توقع نہ تھی۔ اس کے بعد میں انجان بن کر ادھر اُدھر کی فضول باتیں کرنے لگی۔ گویا میں کچھ سمجھی ہی نہیں۔ —— آہ تمہیں کیا خبر ہے کہ وہ الفاظ کہتے وقت میرے دل پر کیا گزر گئی۔ تم میرے دل کو پتھر سمجھو گے۔ لیکن اس پتھریلی چٹان میں سے آنسوؤں کے چشمے ابل چکے تھے۔

تم کچھ کہنے آئے تھے۔ لیکن دل کی بات دل ہی میں رہی۔ اور تم مایوس ہو کر اپنی دکھ بھری نگاہوں کے ساتھ وہاں سے چلے گئے۔ میں نے نگاہ پھیر لی اور اسی وقت اپنی ہمسائی مندا کو بلا یا۔ اور اس کے ساتھ مل کر بلند آواز سے ہنسنے اور باتیں کرنے لگی۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے بھی ضرور میرے قہقہے سنے ہوں گے۔ اور میرا مقصد بھی یہی تھا کہ تم سن لو۔

تمہاری محبت ہی مجھ سے یہ سب کچھ کرا رہی تھی۔ میں نے اپنے دل کو پتھر بنا لیا تھا۔ میں تمہارے دل پر نہایت بے رحمی سے چرکے پر چرکہ لگاتی رہی تاکہ تمہیں یقین ہو جائے۔ کہ میرے پہلو میں دل نہیں اور میں انسانیت سے عاری ہوں۔ میں تمہارے دل سے اپنی یاد بالکل محو کر دینا چاہتی تھی۔ تاکہ میری وجہ سے تمہاری شہرت پر کوئی حرف نہ آئے۔ اس کے علاوہ مجھ پر اپنے عہد کی پابندی بھی فرض تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ اگر میں ذرا بھی تم پر اپنا راز کھول دیتی۔ تو تم بخوشی میری ذلت کا شریک بننا قبول کر لیتے۔ لیکن تم ایک شریف اور معزز گھرانے کے آخری چشم و چراغ تھے۔ اور میں ایک قابل نفرت اچھوت۔ جس کو دیوتا

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اَور انسان دونوں نے دھتکار دیا۔ دو ایسے آدمی کس طرح مل سکتے تھے؛

ایک دفعہ مجھے خیال آیا۔ کہ تم پر ساری حقیقت کھول دوں۔ جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو۔ سُنوں۔ اور جو کچھ میرے دل میں ہے کہوں۔ میں تمہیں بتا دینا چاہتی تھی کہ وہ کیا باتیں ہیں جو مجھے اِس سنگدلی اَور بے رحمی پر مجبور کرتی ہیں۔ اَور اِس طرزِ عمل سے خود مجھ پر کیا گزرتی ہے۔ لیکن میں نے یہ خیال چھوڑ دیا۔ میں تمہیں آگاہ کر کے تمہارا دکھ اور کیوں بڑھاتی۔ میں تو تمہارے دل سے اپنی یاد مٹانا چاہتی تھی —— لیکن اب مجھے خیال آتا ہے۔ کہ کاش میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہوتا۔

کنول کے پھولوں کے پاس ایک دفعہ پھر ہماری مُٹھ بھیڑ ہوئی۔ ہم دونوں کی آنکھوں میں پہلی ملاقات کا نقشہ پھر گیا۔ میں نے نگاہ پھیر لی۔ کہ کہیں میرا راز آشکارہ ہو جائے۔ اَور بے پروائی سے کہا۔ "اِس سال پھولوں کی کتنی کثرت ہے"۔

تم نے کہا۔ "تمہیں یاد نہیں۔ گزشتہ سال بھی تو اِسی قدر پھول تھے۔ اَور ہم دونوں نے اِسی جگہ بیٹھ کر کنول کے پھولوں کا ایک بہت بڑا ہار گوندھا تھا"۔

میں نے کہا —— "بچپن کی ہر فضول بات انسان کو یاد نہیں رہ سکتی"۔

تم نے تعجب سے کہا۔ "یہ تو سال گزشتہ کا واقعہ ہے۔ تم اِس قدر جلد بھول گئیں؟"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "مجھے ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد نہیں رہتیں۔"

تمہاری آواز بھرّا گئی۔ اور تم نے کہا۔ "مجھے تو اس سے بھی چھوٹی چھوٹی کئی باتیں یاد ہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "اچھا پھر اپنی یاد کا کچھ حصّہ مجھے بھی دے دو۔ میں تو اپنی تقریباً تمام کی تمام یاد کھو چکی ہوں۔"

اگر تم مجھے اب ملو۔ تو میں تمہیں بتاؤں کہ مجھے تم سے بھی زیادہ کتنی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد ہیں۔ تمہاری ہر بات، تمہاری ہر نگاہ، تمہاری ہر حرکت تمہاری ہر عادت اور تمہاری ہر پسند و ناپسند ادا میرے دل پر نقش ہے۔ میں ظاہری بے پروائی کے پردے میں تمہارے ہر آرام کا خیال رکھتی تھی۔ لیکن میں تمہیں فریب میں مبتلا رکھنا چاہتی تھی ——— آہ! تم کیوں اس قدر آسانی سے میرے فریب میں آ گئے۔ تم نے حقیقت کو کیوں نہ سمجھ لیا۔

بتدریج میں تم سے اور زیادہ زیادہ الگ رہنے لگی۔ اور کبھی تم سے مل کر سیر یا گفتگو کا وقت نہ نکالتی۔ اس ظاہری بے التفاتی کے زمانے میں میرا دل تمہارے لئے پہلے سے بھی زیادہ مضطرب رہنے لگا میں ہر وقت صرف تمہارے ہی خیالوں میں گم رہتی تھی۔ تمہارے لئے کام کرنے سے مجھے سچی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ اب میرے لئے دنیا میں صرف ایک یہی خوشی باقی رہ گئی تھی۔ کہ مجھے تمہاری خدمت کا موقع

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

حاصل ہے۔ لیکن تمہیں اس کا علم بھی نہ تھا۔ دیوتا اپنے بھگت کی پوجا کی طرف شاذ ہی توجہ کرتا ہے۔

میں ہر صبح مندر میں جاتی۔ اور شو دیوتا کی مورت کے سامنے سجدے میں گر کر اپنا دُکھڑا روتی۔ اور صرف اسی کے سامنے اس بات کا اقرار کرتی۔ کہ میں نے تمہیں فریب دے رکھا ہے۔ لیکن اس سے مجھے تسکین حاصل نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ تمھاری وجہ سے میں نے اپنے دیوتا کو بھی دھوکا دے رکھا تھا۔ جس وقت میں اُس کی مُورتی کے سامنے سر جھکائے کھڑی ہوتی۔ میرے دل میں اپنے معبود کا خیال نہ ہوتا تھا۔ میرے جسم کا رُواں رُواں تمہاری نگاہوں کی گرمی محسوس کرتا تھا۔ مجھے یہ معلوم ہوتا گویا کسی مقدس چشمے کے پاک پانیوں میں میرا سراپا گناہ جسم دُھل کر پاک ہو رہا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگتا۔ کہ تمہاری پاک نگاہ میرے جسم کو اس زندگی میں پاک کر دے گی۔ اور میں دوسرے جنم میں تمہیں فخر کے ساتھ اپنا کہہ سکوں گی ——— سنکھ برابر بلند آواز سے بجتا چلا جاتا۔ اور چاندی کی دیوی کی روشنی سے مندر کے در و دیوار جگمگ جگمگ کرنے لگ جاتے۔ لیکن نہ میرے کان کچھ سُنتے اور نہ میری آنکھیں کچھ دیکھتیں ——— میرے لئے مندر میں تمہارے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ اور اب تک بھی مجھے ہر شام یہی محسوس ہوتا ہے۔ کہ تم بھی مندر میں موجود ہو۔ اور مجھ پر بے خودی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

لیکن جب میں مندر سے باہر نکلتی۔ میرے دل پر خوف سا چھا جاتا۔ اور میں سوچتی۔ کہ میں عبادت میں غفلت کرتی ہوں۔ تو کہیں اس کا وبال تم پر تو نہ پڑے گا۔ کیونکہ میں نے سُنا ہے۔ کہ عورت کو اپنے اعمال کی سزا اکثر اپنے محبوب کی تکلیف کی صورت میں ملتی ہے۔ اور خود تمہارا ایمان بھی تو اِس دیوتا پر نہ تھا۔ تم بھی مندر میں اُس کے لئے نہ آتے تھے۔ اس لئے ہم دونوں گنہگار تھے۔ مگر تم بھی میری ہی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہوئے۔ میں دیوتا کے سامنے شرمساری سے جُھک کر عفو کی التجا نہ کرتی تھی۔ بلکہ یہ کہتی تھی۔ کہ اِس گناہ کا وبال صرف میری ہی جان پر پڑے۔

دادا جان نے مجھے اپنے معبود سے لَو لگانے کی نصیحت کی تھی۔ اَور میں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اس نصیحت پر عمل کروں گی۔ اور اپنی زندگی اپنے دیوتا کے لئے وقف کر دوں گی۔ میں نے عہد کر لیا تھا کہ میں اس جائداد میں سے جس کے حقیقی وارث تمہیں ہو۔ کچھ نہ لونگی۔ میری دِلی آرزو تھی کہ یہ سب کچھ تمھارے سپرد کر دوں۔ اپنے مستقبل کے متعلق یہ سوچتی۔ کہ میں مندر کے نزدیک ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا کر رہوں گی۔ اور وہاں سے کسی خوش نصیب عورت کے ساتھ تمہاری کامیاب اور پُرمسرت خانگی زندگی کو دیکھوں گی۔ مگر ایسے خواب بھی کبھی پورے ہوا کرتے ہیں؟ اب اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ پھر بھی میں امید کا دامن نہیں چھوڑ سکتی ——— میں آخری دم تک

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

تمہارے لئے جائداد کی حفاظت کروں گی۔ اور امید رکھوں گی۔ کہ ایک دن مجھے یہ سب کچھ تمھارے سپرد کر دینا ہے۔

ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ جب میں نے پہلے پہل مندر کی سیڑھیوں کو دھو کر صاف کرنے اور پھولوں سے سجانے کا فرض اپنے ذمہ لیا تھا۔ اگرچہ میں خدا کی حقیر ترین مخلوق سے بھی زیادہ حقیر ہوں۔ لیکن مجھے اس خدمت کی اجازت حاصل ہے۔ ہر شام میں اپنے بالوں سے مندر کی سیڑھیوں کو دن بھر کی گرد سے صاف کرتی ہوں۔ اب یہ تو محض ایک قدیم عادت کی پاسداری رہ گئی ہے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تمہارے قدموں کی پاک اور پیاری گرد کا ایک ذرہ بھی اب وہاں باقی نہ رہا ہوگا۔ آندھیوں نے اُسے اُڑا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہوگا۔

اب مندر میں وہ پہلی سی رونق نہیں ہوتی۔ چند بوڑھی عورتیں اب آتی ہیں لیکن گاؤں کی ان لڑکیوں میں سے جن کے ہجوم کی وجہ سے میرا مندر میں داخل ہونا مشکل ہوتا تھا۔ اب کوئی نظر نہیں آتی۔ اس سال بارش اور ہوا کے طوفان نے کئی گاؤں تباہ کر دیئے طوفان کے دن شام سے پہلے ہی تاریکی چھا گئی۔ رات بھر ہوا کے زور سے بڑے بڑے درخت جڑ سے اُکھڑ کر گرتے رہے۔ کئی کشتیاں ڈوب گئیں۔ دریا کے کنارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے تھے۔ اور خوفناک آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ عناصر دیوانہ وار رقص کر رہے تھے۔ اور

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

انسان کا دِل کانپ رہا تھا۔

شام سے پہلے پہلے پوجا ختم کی گئی۔ لوگ جلد جلد گھروں کو چلے گئے۔ اور میں اپنا روزانہ کام ختم کرنے کے لِئے پیچھے رہ گئی۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ تم بھی وہیں ہو۔

چاندی کے دیوؤں کو صاف کرنے کے بعد میں زمین پر جھکی اور سنگِ مرمر کی سیڑھیوں کو اپنے بالوں سے صاف کرنے لگی۔ اُس وقت شفق کی آخری سُرخ شعاعیں میری سفید اَور زرتار ساڑھی کو روشن بنا رہی تھیں۔ میں نے اپنا یہ کام کبھی کسی کے سامنے نہ کیا تھا۔ تمھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی ہو گی —— چنانچہ تم نے سامنے آکر پوچھا۔— "سنندا! تمہیں کونسی چیز پتھر کی اس مورت کے سامنے جھکنے پر مجبور کرتی ہے؟"

ایک بات میرے لبوں پر آتے آتے رہ گئی۔ لیکن میں یہ راز مرنے سے پہلے تمہیں بھی نہ بتانا چاہتی تھی۔ اس لِئے میں نے جواب دیا۔ "مجھے اپنے دیوتا کا حکم ہے۔"

پھر یکایک تم نے سوال کیا۔— "یہ کیا۔ تم سیڑھیوں کو اپنے بالوں سے کیوں صاف کرتی ہو؟ یہ کس کے پاؤں کی خاک ہے۔ جس کو اِس قدر عزّت نصیب ہے؟"

مَیں نے ہنس کر جواب دیا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں، عورت کیلئے اُس کا محبوب خدا سے بھی برتر ہوتا ہے۔"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

میں تاریکی میں تمہارا چہرہ اچھی طرح نہ دیکھ سکتی تھی۔ لیکن تمہاری آواز بھرّا گئی اور تم نے پوچھا۔ "اُس نے تمہیں اس کے بدلے میں کیا دیا ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "مجھے کسی بدلے کی ضرورت نہیں۔ میں اس پر اپنا سب کچھ نثار کر دینا ہی کافی بدلہ سمجھتی ہوں۔"

پھر تم نے کہا۔ "کیا تم نے سب کچھ اُس پر نثار کر دیا ہے؟ کسی دوسرے کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہی؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہاں، عورت جب محبّت کرتی ہے۔ تو اپنی ہر چیز قربان کر دیتی ہے۔"

تم نے کہا۔ "سنندا کیا اب مجھے بالکل ناامید ہو جانا چاہیئے؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہاں یقیناً۔ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

یہ سُنکر تم بالکل مایوس ہو گئے۔ اور ایک لفظ کہے بغیر چلے گئے میں بھی اِس کے بعد جلد ہی گھر چلی آئی۔

تمام رات میں نے آنکھوں میں کاٹی۔ طوفان کا شور لمحہ بہ لمحہ بلند سے بلند تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ ہوا کے زور سے کبھی کبھی کوئی بڑا درخت گرتا۔ تو اُس کی آواز سے میرے کمرے میں بھی گونج پیدا ہو جاتی۔

صبح اٹھکر جب میں نے باہر دیکھا۔ تو طوفان کی بربادی نے دُنیا کا نقشہ ہی بدل ڈالا تھا۔ پُرانے آثار اور نشان مٹ چکے تھے۔ کئی عمارتیں گر گئی تھیں اور بہت سی جانیں تلف ہو گئی تھیں۔ مگر

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

یہ تمام ویرانی میرے دل کی ویرانی سے زیادہ نہ تھی۔ کیونکہ اُس دن میں اپنا سب کچھ کھو چکی تھی۔ اُس دن سے مَیں نے تمہیں نہیں دیکھا۔ مگر میں آج تک تمہارے انتظار میں ہوں۔ مرنے سے پہلے ایک دفعہ میں تمہیں اپنی داستان سنا لینا چاہتی ہوں۔ لیکن اگر یہ میری قسمت میں نہ ہوا۔ تو پھر شاید اِس خط سے تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائیگا۔

میں ایک دفعہ پھر تمہارا پیارا چہرہ —— تمہاری پیاری آنکھیں جو ہنستے وقت چمک اُٹھتی تھیں۔ دیکھنا چاہتی ہوں —— اور ایک دفعہ پھر تمہارے ساتھ مل کر اسی طرح خوب ہنس لینا چاہتی ہوں —— آنسوؤں کے اِس دریا کی خاموش سطح پر جسے مَیں اپنی زندگی کہتی ہوں اس آخری ملاقات کی یاد ایک سفید شگفتہ کنول کے پھول کی طرح تیر رہی ہوگی۔ اَور بس پھر مَیں اِطمینان کی مَوت مروں گی +

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

بلّی کی رُوح

"مسز عبد القادر"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

مسز عبدالقادر

تعارف:- آپ ایم عبدالقادر صاحب مرحوم و مغفور رئیس جہلم کی اہلیہ اَور پنجاب کے مشہور نوجوان شاعر حضرتِ سراج الدین ظفرؔ کی والدہ محترمہ ہیں۔

آپ عموماً پُراسرار اَور ہیبت ناک افسانے لکھتی ہیں۔ قدیم کھنڈروں، ہری بھری وادیوں، کہساروں، مرغزاروں وغیرہ کے ماحول کو پُراسرار اَور دہشت آفرین بنانے میں آپ کو غیر معمولی ملکہ حاصل ہے۔ منظر نگاری آپ اس سلیقہ سے کرتی ہیں۔ کہ آپ کا افسانہ پڑھ کر دِل بے اختیار افسانے کے پس منظر کو بچشمِ خود دیکھنے کے لئے مضطرب ہو جاتا ہے۔

آپ کے افسانوں کی زبان دِلکش۔ صاف ستھری اَور رواں ہوتی ہے۔ آپ کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ "صدائے جرس" اَور "لاشوں کا شہر" آپکی دو قابلِ قدر تصنیفات ہیں۔

آپ سیر و سیاحت کی بے حد دِلدادہ ہیں۔ آپ کے اِس رجحان کی جھلک بارہا آپ کے افسانوں میں بھی نظر آجاتی ہے۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

(۱)

گیتی آرا گلنار سے جس قدر محبت کرتی تھی۔ شجاع اسی قدر اس سے نفرت کرتا تھا۔ جب کبھی وہ اسے دیکھ پاتا۔ نہایت غضبناک ہو کر کہتا۔ "گیتی آرا! اِس ڈائن کو یہاں سے دُور کرو۔ ورنہ مَیں اس کے گولی مار دُوں گا"

درحقیقت وُہ تھی بھی ڈائن۔ اُسے یہ کہنا بالکل موزوں تھا۔ اس کا رنگ سیاہ اور شکل مکروہ تھی۔ مگر اپنی اپنی طبیعت ہے۔ گیتی آرا اس پر دل وجان سے فدا تھی۔ جب تک گلنار نہ کھا لیتی۔ گیتی آرا کے حلق سے نوالہ نہ اُترتا تھا۔

گلنار بھی بڑی سمجھدار تھی۔ اِس کی محبت کو محسوس کرتی اور اُس کا دِل خوش کرنے کے لئے طرح طرح کی حرکتیں کیا کرتی۔ وُہ نہایت صفائی پسند تھی۔ بڑے سلیقے سے کھانا کھاتی۔ اور ایک گدیلے والی کرسی پر جو گیتی آرا نے خاص اسی کی خاطر بنائی تھی بیٹھی رہتی۔ جب شجاع کے پاؤں کی آہٹ

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

سنتی۔ تو جھٹ اچک کر گیتی آرا کے ڈریسنگ روم میں گھس جاتی۔ اور جب تک شجاع گھر میں رہتا۔ اونچا سانس تک نہ لیتی۔ گیتی آرا اس کی عقل مندی کی بہت معترف تھی۔ وہ اکثر بڑے فخر سے کہا کرتی۔ کہ جتنی عقلمند میری گلنار ہے۔ اتنا عقلمند کوئی انسان بھی نہیں۔

(۲)

شجاع اور گیتی آرا کی آپس میں بڑی محبت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ ان کی شادی کو پانچ سال گزر گئے تھے۔ مگر نخل امید بار ور نہ ہوا تھا۔ وہ ایک کامیاب بیرسٹر اور والدین کا اکلوتا فرزند تھا۔ چنانچہ اس حالت میں گیتی آرا کا بانجھ ہونا سخت خطرناک تھا۔

شجاع کے والدین اس کو با اولاد دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ اسکی والدہ کی عین آرزو تھی۔ کہ اس کا سونا گھر ایک معصوم اور شوخ ہستی کی برکت سے بارونق ہو۔ کوئی اُسے توتلی زبان سے 'دادی اماں' کہے۔ اسے دلفریب شرارتوں سے ستائے اور معصومانہ اداؤں سے مچل کر اس کا دل لبھائے۔ گیتی آرا بھی اس کمی کو محسوس کرتی۔ مگر یہ خدا کی دین ہے کسی کے بس کی بات نہیں

جوں جوں دن گزرتے جاتے گیتی آرا کے تفکرات میں اضافہ ہوتا جاتا۔ کیونکہ اس کا مستقبل تاریک تھا۔ اپنے حسرتناک انجام کا نقشہ اسے آنکھوں کے سامنے دکھائی دیتا۔ اور وہ اکثر اپنی محبت کی پامالی کے خیال سے تھرا اٹھتی تھی۔ جب تک شجاع گھر میں رہتا۔ گیتی آرا کا دل بہلا رہتا۔ مگر جونہی وہ عدالت

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کو جاتا۔ وُہ افسردہ ہو جاتی۔ کیونکہ گھر میں کوئی اس سے کھل کر بات چیت نہ کرتا تھا۔ اِس لئے اُس نے اپنا غم غلط کرنے کو گلنار، پال رکھی تھی۔ جو اُس کی محبوب بلّی تھی۔ وُہ اکثر تنہائی میں اس سے باتیں کیا کرتی۔ جس کے جواب میں گلنار اُس کو ایسی نگاہوں سے دیکھتی۔ جس سے ظاہر ہوتا کہ وُہ اسکی باتیں سمجھتی اور دُکھ درد میں اُسکی شریک ہے۔

شجاع کو والدین بارہا دوسری شادی کے لئے کہہ چکے تھے۔ مگر وہ انکار کرتا رہا۔ آخر جب ان کا اصرار حد سے بڑھگیا تو مجبوراً اسے رضامند ہونا پڑا۔

(۳)

شجاع کی دوسری شادی کو بھی مدت گزر گئی مگر بچے کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ اسکی والدہ ہنوز زندہ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک دفعہ شجاع کی شادی کر کے قسمت آزمائی کرے لیکن اب اُس کا نئی بہو سے سابقہ تھا۔ جس نے شجاع پر اِس طرح قابو پالیا تھا۔ کہ اُسے دم مارنے کی جرأت نہ تھی گیتی آرا کو وُہ بالکل بھول چکا تھا۔

شہزادی اپنی چالاکیوں سے اس کو موقع ہی نہ دیتی تھی۔ کہ وہ کسی سے ملنے کیلئے وقت نکال سکے۔ وہ ہر وقت اُس کی ناز برداریوں میں مصروف رہتا۔ شجاع کے اِس طرزِ عمل سے گیتی آرا کو سخت قلق ہوتا تھا مگر وہ راضی برضا تھی۔ شہزادی شکل و صورت میں تو گیتی آرا کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ مگر ناز نخروں میں طاق تھی۔ مرد کی تسخیر کا گُر جانتی تھی۔ وُہ سخت مزاج۔ کمینہ خصلت

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اور تُند خو عورت تھی۔ اُس کا باپ ایک اعلیٰ خاندان کا رُکن تھا۔ لیکن ماں بازاری عورت تھی۔ اور ماں کی تربیت کا اثر اُس کے رگ و ریشہ میں سرایت کئے ہوئے تھا۔ وہ گیتی آرا کے خون کی پیاسی تھی۔ اُس نے محلسرا کی طرف کھلنے والے دروازے عرصہ سے بند کرا دیئے تھے تاکہ شجاع کی نظر کہیں گیتی آرا پر نہ پڑ جائے۔ اِس انقلاب نے گیتی آرا پر دنیا کا عیش و آرام حرام کر دیا۔ اُس کی اس بے کیف زندگی میں واحد غمگسار اس کی پیاری بلّی تھی۔

(۴)

جنوری کے آخری دن تھے۔ شجاع خواب راحت سے بیدار ہوا تو اس کی نظر میز پر رکھے ہوئے چنبیلی کے ایک خوبصورت ہار پر پڑی جس کے قریب ہی ایک رقعہ پڑا تھا۔ رقعہ دیکھکر اُسے یاد آگیا۔ کہ آج اس کی پہلی شادی کی سالگرہ ہے۔ اُس نے ہار اٹھا کر آنکھوں سے لگا لیا۔ بھولی ہوئی گیتی آرا کی یاد تازہ ہو گئی۔ گزشتہ ایام کی پُر محبت زندگی کا نقشہ سینما کی متحرک تصاویر کی طرح آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ اُسے اپنے ظالمانہ سلوک سے جو چھ سال سے اُس کے ساتھ روا رکھا تھا سخت ندامت ہوئی۔ وہ آہ سرد بھر کر کہنے لگا۔ "آہ گیتی آرا کیسی عقلمند ہے۔ زرد چنبیلی کا ہار بھیج کر اُس نے مجھے اس بے اعتنائی پر ملامت کی ہے۔ کیا اس سے میری محبت انہی پھولوں کی طرح زرد ہو چکی ہے"۔

وہ ایک ہارے ہوئے قمار باز کی طرح ہار کو ہاتھ میں لئے کرسی پر بیٹھ گیا بہت عرصہ تک انہی خیالات میں محو رہا۔ اور ابھی خدا جانے کب تک اس عالت

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ہیں رہتا۔ مگر شہزادی کی کرخت آواز سے چونک اُٹھا۔

شہزادی۔ کیا اس بے ہودہ عورت نے اس دفعہ پھر زرد پھولوں کا تحفہ بھیجا ہے۔ یہ پھول تو تابوت پر ڈالے جاتے ہیں۔ کون نمکحرام یہ ہار یہاں لایا ہے؟!

یہ کہتے ہوئے اُس نے وہ ہار شجاع کے ہاتھ سے نوچ کر پھینک دیا اس کے بعد گیتی آرا کو کوستی اور نوکروں کو بُرا بھلا کہتی کمرے سے نکل گئی شجاع نے منہ سے تو کچھ نہ کہا۔ مگر اُس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ وہ سوچنے لگا۔ کیا معلوم گیتی آرا کا تحفۂ محبت ہر سال اسی طرح پائے استحقار سے ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ وہ تمام دن مغموم رہا۔ شام کے قریب جب وہ باہر سیر کو گیا۔ تو بغیر کسی ارادہ کے چلتا ہوا باہر کے راستے سے محلسرا میں داخل ہو کر سیدھا گیتی آرا کے کمرے میں جا نکلا۔ گیتی آرا دریچہ کے قریب بیٹھی بحر فکر میں غوطہ زن تھی۔ وہ خاکی رنگ کے کپڑے پہنے تھی۔ اس کے عنبر افشاں سیاہ بال اُلجھے ہوئے کندھوں پر پریشان تھے۔ سورج کی آخری کرن اس کے زردی مائل دلفریب چہرہ کو چار چاند لگا رہی تھی۔ گلنار بھی اپنی کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

وہ کئی منٹ تک دروازہ میں کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ گیتی آرا اپنے خیالات کی رو میں بہ رہی تھی۔ شجاع کی موجودگی کا اسکو مطلق احساس نہ ہوا اگر گلنار نے اسے نیم وا آنکھوں سے دیکھتے ہی فوراً اُچھلا نگ لگائی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

گلنار کی اس حرکت پر وہ ایکدم چونک پڑی اور سامنے شجاع کو کھڑا

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

دیکھ کر بے اختیار ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی اور لڑکھڑاتی ہوئی اس کے استقبال کو بڑھی لیکن شجاع وہیں کھڑا رہا۔ ندامت سے اس کے پاؤں بھاری ہو رہے تھے۔

(۵)

اِس واقعہ کے بعد شجاع شہزادی سے چوری چھُپے اکثر گیتی آرا کے پاس آتا جاتا رہا۔ جب اِس ملاپ کو ایک سال کے قریب ہو گیا۔ تو یکا یک گیتی آرا سخت بیمار ہو گئی۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ اور سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ پہلے تو معمولی بات سمجھ کر اُس نے کسی سے بیماری کا ذکر نہ کیا۔ لیکن آخر جب تکلیف زیادہ بڑھ گئی تو ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ جو معائنہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ مسز شجاع اُمید سے ہیں۔

یہ نویدِ جانفزا سن کر فرطِ طرب سے شجاع کی باچھیں کھِل گئیں۔ بڑی بیگم نے منہ مانگی مُراد پائی۔ شہزادی نے جب یہ خبر سنی تو وُہ سناٹے میں آ گئی۔ مگر کیا کر سکتی تھی۔ گتھی سلجھنے والی نہ تھی۔ جل بھُن کر رہ گئی۔ آخر اُس نے اس غداری کا بدلہ لینے کی ٹھان لی۔

شجاع کو خوف تھا کہ نہ جانے اب شہزادی کیا آفت برپا کرے مگر برخلاف اسکے شہزادی نے اسے مبارکباد دی۔ اور اس خبر پر نہایت خوشی کا اظہار کیا۔ اور رفتہ رفتہ گیتی آرا سے بھی راہ و رسم بڑھا کر اپنی ریاکارانہ محبت میں اُسے ایسا اسیر کر لیا۔ کہ وُہ اُس کا دم بھرنے لگی۔ گیتی آرا کا کمرہ بازار کے سرے پر واقع تھا جس کے نیچے ہر وقت دکانداروں کی کرخت آوازیں۔ موٹروں اور تانگوں کا شور و غل بپا رہتا۔ شہزادی اب اکثر اس کے کمرے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

میں آتی اور دریچہ میں بیٹھ کر پہروں اس پُر رونق بازار کی سیر دیکھا کرتی۔
شام کا وقت تھا۔ گیتی آرا اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹی تھی۔ کہ شہزادی مسکراتی ہوئی اندر آئی۔ اُس کے ہاتھ میں مٹھائی کی ایک پلیٹ تھی۔

شہزادی۔ بہن آج طبیعت کیسی ہے ؟

گیتی آرا۔ بدستور خراب ہے۔

شہزادی۔ کچھ کھایا پیا بھی ہے ؟

گیتی آرا۔ بہن کھانے کو جی نہیں چاہتا۔

شہزادی۔ اس طرح فاقہ کرنے سے تو بہت کمزور ہو جاؤ گی۔ لو یہ تھوڑی سی مٹھائی کھا لو۔ امّی جان نے نیاز کی بھیجی تھی اور یہ تمہارا حصہ ہے۔

گیتی آرا کی طبیعت آج بہت بدمزہ تھی۔ اُسے متلی ہو رہی تھی۔ مگر شہزادی کے خوش کرنے کو اُس نے پلیٹ اُس کے ہاتھ سے لے لی اور رس گلا اٹھا کر کھانے لگی۔

شہزادی مسکراتی ہوئی دریچہ میں بیٹھ کر بازار کا منظر دیکھنے لگی۔ گیتی آرا نے رس گلا تو اٹھایا مگر کھانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اُس نے شہزادی کی آنکھ بچا کر سب مٹھائی گلنار کی پلیٹ میں ڈال دی اور خود یونہی منہ ہلاتی رہی اور جب گلنار مٹھائی ختم کر چکی۔ تو گیتی آرا نے شہزادی کو دکھانے کے لئے تولیہ سے منہ ہاتھ پونچھ کر خالی پلیٹ میز پر رکھ دی۔

(۶)

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ یکایک گلنار کرب و اضطراب سے

CC-0 In Public Domain. Digitized by eGangotri

لوٹنے لگی۔ گیتی آرا کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے بیدار دیکھ کر گلنار نہایت دردناک آواز سے کراہنے لگی۔ اس کی حالت متغیر تھی۔ پتلیاں پھر گئی تھیں سانس رُک رُک کر آتا تھا۔ اور وہ کوئی دم کی مہمان معلوم ہوتی تھی۔

گیتی آرا کی آنکھوں میں دُنیا اندھیر ہو گئی۔ وہ انتہائی الم سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور بے اختیار اُس کے آنسو جاری ہو گئے۔ اتنے میں کسی نے زور سے دستک دی گیتی آرا سہم گئی کہ اس وقت دستک کے کیا معنی۔ آخر دِل کڑا کر کے پوچھا کون ہے؟ "جلدی دروازہ کھولو"۔ کسی نے کہا۔

آواز پہچان کر گیتی آرا نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ شجاع بوکھلایا ہوا اندر آیا۔ اور کہنے لگا۔ "اُف گیتی آرا! غضب ہو گیا۔ جلدی چلو۔ شہزادی قریب المرگ ہے۔"

اِس ناگہانی خبر سے گیتی آرا کے دِل پر دھکا سا لگا۔ وہ کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ اور پھر درویش بر جانِ درویش گلنار کو اُسی حالت میں چھوڑ کر شجاع کے ساتھ چل دی۔

گیتی آرا کو دیکھ کر شہزادی باوجود انتہائی کرب کے بستر سے اچھل پڑی "آہ تم ابھی زندہ ہو"۔ اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"کیوں کیا ہے؟" شجاع نے کانپ کر کہا۔

شہزادی۔ (مایوسانہ نگاہوں سے دیکھ کر) میں نے پہلے اُس کو مٹھائی میں سنکھیا ملا کر کھلایا اور بعد میں خود کھایا۔ مگر تعجب ہے کہ اُس پر ابھی تک کچھ اثر نہیں ہوا۔"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

شہزادی کی زبان سے یہ الفاظ سن کر شجاع مضطرا اٹھا۔ مگر گیتی آرا کہنے لگی "بہن جیسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے"۔ میں نے وہ مٹھائی خود نہیں کھائی تھی۔ بلکہ گلنار کو دے دی تھی۔ آہ، وہ بے چاری مجھ پر صدقے ہو گئی۔ اور ابتک یقیناً مر چکی ہو گی"۔

شہزادی۔ (اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے) آہ تم زندہ ہو۔ اور میں اس دُنیا سے نامراد جا رہی ہوں۔ افسوس صد افسوس!"

اُس کی آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ ناک ٹیڑھی اور اعضاء بے حس و حرکت ہو گئے۔ وہ کئی منٹ تک بالکل خاموش رہی۔ پھر یکایک اُس نے اپنی سب قوتوں کو یکجا جمع کر کے پھر آنکھیں کھول دیں اور اپنی نظریں بحال کر کے کہنے لگی

شہزادی "گیتی آرا! تم خوش ہو گی کہ میں مر رہی ہوں لیکن یاد رکھو میری رُوح تم سے ضرور انتقام لے گی"۔ اتنا کہتے ہوئے اس کی گردن کا منکا ڈھلک گیا۔ اور رُوح تن سے جُدا ہو گئی۔

(۷)

شہزادی کی تجہیز و تکفین کے بعد گیتی آرا جب اپنے گھر گئی۔ تو یہ دیکھ کر اُس کے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ گلنار صحیح و سلامت اپنی کرسی پر بیٹھی ہے۔

اس حادثہ کے دو مہینے بعد خدا نے گیتی آرا کو چاند سا بیٹا عطا کیا مگر افسوس یہ خوشی ان لوگوں کو زیادہ دیر تک دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ بچہ

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

پندرہ دن زندہ رہ کر گھر والوں کو داغِ مفارقت دے گیا۔

بچے کی موت سے گیتی آرا اور شجاع نہایت دل برداشتہ ہوئے بڑی بیگم کو تو ایسا صدمہ ہؤا کہ وُہ جانبر نہ ہو سکیں۔ ان کے بعد گھر کی رہی سہی رونق بھی کافور ہو گئی۔ شجاع تو پھر بھی باہر جا کر دو گھڑی دل بہلا لیتا مگر گیتی آرا تصویر یاس بنی ہوئی ہر وقت کڑھتی رہتی - در و دیوار کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ اُسے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ گلنار نے بھی اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

جب سے گلنار اس خوفناک موت کے منہ سے بچی تھی۔ اُس دن سے اسکی عادتیں بالکل بدل گئی تھیں۔ وُہ نہایت غصیلی اور خونخوار ہو گئی تھی۔ اب وُہ اکثر اوقات گیتی آرا پر غرّاتی اور شجاع کو دیکھ کر بھی سامنے ڈٹی رہتی۔ اور اکثر رات کو ایسی خوفناک آواز نکالکر روتی کہ سننے والوں کے دل دہل جاتے۔

گیتی آرا نے اب اُس کے گلے میں پٹہ ڈال دیا تھا۔ یہ تمام دن برآمدے میں زنجیر سے بندھی رہتی اور رات کو کھول دی جاتی۔

ڈیڑھ سال کے بعد پھر گیتی آرا کے لڑکی پیدا ہوئی۔ مگر وُہ بھی پندرہ دن تک رہ کر بغیر کسی بیماری کے اچانک مر گئی۔

اس بچی کی موت سے شجاع کو وہم ہو گیا۔ کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے۔ وُہ رات کو اکثر ڈراؤنے خواب دیکھتا تھا۔ چنانچہ ان توہمات کے زیر اثر اُس نے وُہ گھر چھوڑ دیا اور باہر کوٹھی میں سکونت اختیار کر لی۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

یہاں آکر بھی اِن خوفناک خوابوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ اکثر دیکھتا کہ گلنار گیتی آرا کے سرہانے بیٹھی ہنس رہی ہے۔ اور بعض دفعہ اسے محسوس ہوتا کہ گلنار کا قد بڑھتے بڑھتے گدھے جتنا ہو گیا ہے۔ اس کا خیال تھا۔ کہ یہ واقعات عالمِ بیداری کے ہیں۔ مگر گیتی آرا اس کے خیال کو تمسخر میں اُڑا دیا کرتی تھی۔

اسی سال گیتی آرا کو پھر امید واری ہوئی۔ شجاع کے باپ کے دوست شیخ نیاز احمد نے جو ایک عالمِ باعمل تھے۔ استخارہ کر کے شجاع کو بتایا کہ گیتی آرا کے بچوں پر کسی بدرُوح کا سایہ ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک تعویذ دیا۔ کہ جب بچہ پیدا ہو تو اس کے گلے میں ڈال دیا جائے۔

اتفاق کی بات سمجھو یا خدا کی قدرت۔ گیتی آرا کا تیسرا بچہ اصغر زندگی والا پیدا ہوا۔ شجاع اور گیتی آرا کے رنج و اندوہ مسرت میں تبدیل ہو گئے اور وُہ اپنے آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ خوش قسمت تصور کرنے لگے۔

بچہ نہایت تندرست اور موٹا تازہ تھا۔ والدین کا اعتقاد تھا کہ بچے نے تعویذ کی برکت ہی سے زندگی پائی ہے۔ چنانچہ وُہ تعویذ کسی وقت بھی اس کے گلے سے علیحدہ نہ کیا جاتا تھا۔

(۸)

شام کا وقت تھا۔ آج اصغر کی پہلی سالگرہ تھی۔ گیتی آرا کا کمرہ دُلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ گلدستوں کی بُوباس سے تمام کوٹھی مہک رہی تھی۔ برقی قمقموں کی تیز روشنی شیشے کے سامان پر پڑ کر نہایت دلفریب سماں پیش

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کر رہی تھی۔ جابجا دروازوں پر زرتار سہرے لٹک رہے تھے جو ایسی تقریب پر اکثر باندھے جاتے ہیں۔ در و دیوار سے شادمانی ٹپک رہی تھی شجاع میز کے قریب کھڑا نہایت خوشی سے اُن تحائف کو دیکھ رہا تھا جو میز پر قرینے سے رکھے تھے۔ اور کمرے کی زینت کو دوبالا کر رہے تھے۔ یہ وہ تحائف تھے۔ جو شجاع اور گیتی آرا کے عزیزوں نے اصغر کو سالگرہ پر دیئے تھے۔

مہمان عورتیں رخصت ہو گئیں۔ گیتی آرا اصغر کو گود میں لئے اندر داخل ہوئی۔ بچے کو دیکھ کر شجاع کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔ اُس نے بچے کو ماں کی گود سے لے لیا۔ اور ایک کرسی پر بیٹھ کر اُس سے کھیلنے لگا۔ یکایک اس کی نظر بچے کے گلے پر پڑی وہ گھبرا کر کہنے لگا۔

"گیتی آرا اس کا تعویذ کہاں ہے؟"

یہ سنتے ہی گیتی آرا سٹپٹائی ہوئی غسل خانے کی طرف بھاگی۔ اس نے نہلاتے وقت تعویذ اُتار کر شیلف پر رکھا تھا۔ مگر اب اس کا نام و نشان تک نہ تھا۔ تعویذ کی گمشدگی سے ان کے دل بجھ گئے اور رنگ فق ہو گیا۔ تمام مسرتیں یکدم کافور ہو گئیں۔ اور دونوں عالم یاس میں بچے کو لے کر پلنگ پر بیٹھ گئے۔

رات طویل اور خوفناک تھی۔ بارہ بجے کے بعد جھکڑ چلنا شروع ہوا۔ بارش کے ساتھ اولے بھی پڑنے لگے۔ رعد کی گرج اور برق کی چمک نے قیامت برپا کر دی۔ ہوا نے وہ زور باندھا کہ الاماں!

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کمرے میں اُداسی چھائی تھی۔ پچھواڑے کی طرف برج میں گلنار بیٹھی نہایت پُر درد آواز میں "میاؤں میاؤں" کر رہی تھی۔ اس کی ہولناک آواز شب تار کی نحوست میں دو چند اضافہ کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صد ہا رُوحیں بین کر رہی ہیں۔

باہر توشہ خانے کی طرف سے برتنوں کی جھنکار سنکر گیتی آرا کے کان کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر کھٹکا ہوا۔ پھر پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ وُہ کانپنے لگی۔ شجاع نے اُسے تسلی دینے کی غرض سے پستول بھر کر پاس رکھ لیا۔

اتنے میں روشندان سے دھماکے کے ساتھ کوئی چیز گری۔ گیتی آرا خوف سے اچھل پڑی۔ شجاع نے کہا "اوہو یہ تو گلنار ہے۔" گلنار آتے ہی ڈریسنگ روم میں گھس گئی۔ شجاع نے اُٹھ کر ڈریسنگ روم کے دروازے کی چابی گھما دی تاکہ گلنار باہر نہ نکل سکے۔

رات چوتھائی کے قریب گزر چکی تھی۔ شجاع اور گیتی آرا کی آنکھ لگ گئی۔ یکایک گیتی آرا نے خواب میں دیکھا کہ شہزادی اس کے ساتھ ہاتھا پائی کر کے بچہ چھیننا چاہتی ہے۔ دہشت سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اتفاقاً اس کی نظر ڈریسنگ روم کے دروازے پر جا پڑی۔ دروازہ آہستہ آہستہ کھلا۔ ایک عورت اندر سے نمودار ہوئی۔ گیتی آرا چیخ مار کر بیہوش ہو گئی۔ شجاع جاگ اٹھا۔ اُس نے دیکھا کہ شہزادی پلنگ کے قریب بچے پر جھکی ہوئی ہے۔ گھبرا کر اُس نے یکایک پستول داغ دیا۔ ایک خوفناک چیخ

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کے ساتھ دھم سے کوئی چیز زمین پر گر کر کراہنے لگی۔

یکلخت بجلی فیوز ہو گئی۔ کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ شجاع حواس باختہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اِدھر اصغر نے گلا پھاڑ پھاڑ کر رونا شروع کر دیا۔ اُس کے رونے سے شجاع کی کچھ ڈھارس بندھی، اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

مطلع صاف ہو چکا تھا۔ آخری مہینے کے چاند کی پھیکی روشنی کمرے میں پڑنے لگی۔ شجاع نے بچے کو اٹھا لیا۔ اتنے میں گیتی آرا بھی ہوا کے تازہ جھونکوں سے ہوش میں آ گئی۔ اور "میرا بچہ" کہکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"تمہارا بچہ محفوظ ہے"۔ شجاع نے کہا۔ پھر نوکر کو بلانے کے لئے گھنٹی دبائی اور گیتی آرا کا ہاتھ پکڑ کر برآمدے میں لے آیا۔

اتنے میں نوکر بھی آ گیا۔ شجاع نے اُسے لیمپ جلانے کا حکم دیا لیمپ روشن ہونے پر دونوں اندر گئے۔ یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کہ بجائے شہزادی کے فرش پر گلنار کی لاش پڑی ہے۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

شادی

"عصمت چغتائی"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

عصمت چغتائی

تعارف۔ محترمہ عصمت چغتائی صاحبہ بی۔اے۔بی۔ٹی ہندوستان کے مشہور و معروف ادیب جناب عظیم بیگ چغتائی کی ہمشیرہ ہیں اور ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ جس کے علم دوست افراد نے ہندوستان کے ادبی حلقوں سے ہمیشہ خراج تحسین وصول کیا ہے۔

آپ ہندوستان کی ان افسانہ نگار خواتین میں سے ہیں جن پر اُردو ادب کو مخر و ناز ہے

آپ ایک حقیقت نگار افسانہ نویس ہیں۔ فطرت انسانی کی کمزوریوں کی تصویر کھینچنے میں آپ کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ بازی گاہ عالم کے چلتے ہوئے کرداروں کے نفسیات کا تجزیہ کرنے میں جس قدر سلیقہ آپ کو حاصل ہے شاید ہی ہندوستان کے کسی اچھے سے اچھے افسانہ نگار کو حاصل ہو۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

جیسے ہی لال پیلی جھنڈیوں کی قطاریں اور رنگین کھمبے نظر آنے لگے۔ میں نے تانگہ رکوا کر اترنے کی تیاری کی۔

"ابھی تو بہت دور ہے سرکار" تانگے والا گھوڑے کو چابک سے سہلا کر بولا

"رہنے دو بس لو۔ کتنے دام ہوئے تمہارے؟" میں نے چونی دیتے ہوئے کہا۔

"گیٹ تک چلوں!" وہ چونی داب کر بولا۔

"نہیں"

میں اتر پڑی۔ گدھے کو یہ بھی نہیں معلوم تھا۔ کہ راجہ کالی چرن کے یہاں تانگے میں آنا کس قدر ویسا ہے۔ ذرا غور کیجئے۔ تو پتہ چلے کہ اگر مانگے کی سب موٹریں عین موقع پر غائب ہو جائیں۔ اور کرائے کی ٹیکسی ڈھونڈے نہ ملے تو کیسی مصیبت ہو جاتی ہے۔

بھرے ہال کے سامنے ٹانگیں تھرتھرانے لگیں۔ خیر سے مسٹر دوبے اپنے مخصوص قہقہوں کو دباتے ہوئے استقبال کو مل گئے۔

"آپ آ گئیں میں کار لے کر جانے ہی والا تھا!"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

میں اپنی جلدی پر پچھتائی۔ تانگے کے جھٹکوں کو کوستی آگے بڑھی۔ ہال جگمگ کر رہا تھا۔ فرش پر پاؤں پھسلے جاتے تھے۔ آنکھوں کے سامنے ننھے تارے تھرکنے لگے۔ دور کہیں چھپا چھپا یار عنوان دھیمے اور میٹھے سروں میں بج رہا تھا۔ میری ناتجربہ کار آنکھوں کے لئے یہ الف لیلہ کے کسی پرستانی سین سے کم نہ تھا۔ مسٹر دوبے نہ جانے کیا بڑبڑائے جا رہے تھے۔ میں تو نئی نئی تراش کے جمپروں کو تکتی۔ ساڑھیوں کے رم جھم لاتے جھول دیکھتی بہی چلی جا رہی تھی۔ اور دوبے کے کھٹکے وا ہے لوچ قہقہے ذرا جگا دیتے تھے۔

کسی نے مجھے پیچھے سے کھینچا اور میں سیلیا کو دیکھتے ہی گھوم پڑی۔ اس کے پاس ہی بیٹھے ہوئے نجانے کون صاحب جلدی سے اچک کر کرسی خالی کر گئے۔ اور میں شکریہ ادا کئے بغیر بیٹھ گئی۔ دوبے کے قدم آگے نکل گئے جب انہیں پتہ چلا کہ میں راہ ہی میں ٹپک گئی۔ تو راکی ذرا اُن کا ہاتھ سر کھجانے کے لئے اٹھا۔ مگر پھر وہ مہمانوں کے ریلے کو سنبھالنے کیلئے بڑھ گئے

سیلیا نے بعد میں قاعدہ بتانے کا وعدہ کر کے مجھے بٹے ہوئے پتّوں کی گڈّی پکڑا کر کھیل شروع کر دیا۔ نہ جانے ہم کیا کھیل بڑی تندہی سے کھیلنے لگے بس قہقہے زیادہ لگانے پڑتے تھے اور ہاتھ کم ہلتے تھے۔ وہی صاحب جو کرسی دے کر پاس والے کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گئے تھے ازراہ کرم مجھے بتانے لگے

"ہلیں یہ کیا چل رہی ہیں آپ۔ کٹ تو نہیں جائیگا" وہ میرے ہاتھ سے پتا پکڑ کر بولے۔

میں قطعاً نہ سمجھی کہ کیا کٹ جائے گا۔ اور ان کی اس گستاخی پر

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

غور کرنے لگی جو انہوں نے پتّہ چھین کر کی تھی۔

"آپ یہ چلیئے!" وُہ میرے پیچھے کھڑے ہو کر بتلانے لگے۔

"بھئی بتانے کی اجازت نہیں ہے نُور!"

لیکن بتانے کے خلاف بھاؤ کرنے والے میرے لئے زبردست معمّا حل کر گئے یعنی یہ کرسی دینے والے صاحب نور تھے۔ کون نور؟ یہ مجھے اسی وقت معلوم ہوا۔ ٹینس کے بہترین کھلاڑی۔ آئی سی، ایس کے کامیاب کن۔ سوسائٹی کی جان۔ دوستوں کے ٹھیکیدار۔ اور نہ جانے کیا الّم غلّم۔

اور وُہ برابر میرے پتّے چلنے لگے۔ مگر اس سے پہلے کہ وُہ اگلا پتّا پکڑتے میں نے خود ہی جلدی سے ڈال دیا۔ اور وُہ صرف میری انگلی نوچ کر رہ گئے۔ سب زور سے ہنسے اور انہوں نے بھی معافی مانگی بڑی معصومیت سے۔

اس کے بعد ہم لوگ اس سے بھی اوندھا اور دیوانہ سا کھیل چند گولیوں اور چوکھٹے کی مدد سے کھیلنے لگے مسٹر دُوبے مہمانوں کو شاید ہانک چکے تھے۔ کیونکہ وُہ بھی اپنے مخصوص قہقہوں سے کھیل کو اور بھی پگھلائے دے رہے تھے۔

اس پر میں نے بعد میں غور کیا کہ سارے ہال میں سوائے نُور کے سب ہی اسیاہ ڈنر سوٹ میں جکڑے ہوئے تھے۔ مجھے یہ معلوم کر کے ذرا بھی تعجب نہ ہوا کہ نُور سیدھے ٹینس کورٹ سے پکڑ کر لائے گئے تھے۔ اور سفید پتلون اور سبز قمیض کی معافی کیلئے انکار کیٹ اور مفلر وغیرہ سامنے ہی میز پر رکھا ہوا بار بار مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ آج آخری ڈنر پر سب کے لئے سبز قمیض اور

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

سفید پتلون پہننا لازمی کیوں رکھا گیا۔ میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اگر اب کے نینی تال جانا ہوا یا مسوری گئی تو سفید پتلون اور سبز قمیض شام کو پہننے میں کیا صرف ہو گا؟

ڈنر اس قدر زیادہ دلچسپ رہا کہ جلد ہی مجھے وہ پریشانی جو چاندی کے بوجھل چمچوں کو قابو میں لانے میں اٹھانا پڑ رہی تھی غائب ہو گئی۔ مسٹر ڈوبے جو بالکل قریب ہی بیٹھے تھے۔ بار بار گزرے ہوئے کھیل کے بعد سے پچ کا ذکر کرتے کہتے چھوڑ رہے تھے۔ نور کا بھی ذکر آیا۔ وہ ایک بھورے بالوں والی ہلکی پھلکی چھوکری سے کچھ اس انہماک سے باتیں کر رہے تھے کہ چاندی کے چمچے مجھے پھر بے ڈول۔ بڑے اور بوجھل معلوم ہونے لگے۔ مسٹر ڈوبے نے کئی بار لوگوں کو چمچے اور چھری کے جھٹکے سے متعارف کرا دیا۔

"یہ مسٹر سنگل ہیں ایم، ای، ڈی اور وہ (آلو کی نوک سے اشارہ کر کے کہنے لگے) مسٹر...... آں...... وہ مختار۔" مسٹر مختار بُت کی طرح خاموش اور ذرا پختہ سن کے دراز قد انسان تھے۔ جب ہم لوگ تاش کھیل رہے تھے اُس وقت بھی وہ دور میز سے ٹیک لگائے نہ جانے کیا سوچ سوچ کر دھواں اڑا رہے تھے۔ اُن کا لکڑی کے کاروبار کا کچھ جھگڑا تھا۔ کئی دفعہ میں نے انہیں اپنے گروہ کی طرف بلکہ خود اپنی طرف دیکھتے دیکھا لیکن پتہ نہیں کہ کیوں وہ ویسے ہی غیر دلچسپ رہے۔

"بڑا شریف آدمی ہے بیچارا تین چار جگہ بیوپار چلتا ہے اس کا" مگر میں مرعوب ہوئی۔ ڈنر کے بعد عجیب کھیل شروع ہوئے ہم دو دو ہو کر کھڑے ہو گئے۔ یہاں تک کہ راجہ صاحب جب میرے ساتھی بنائے گئے۔ تو وہ بھی مسکراتے ہوئے دائرہ میں آ گئے۔ ہم لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے اور ہمارے ساتھی پیچھے کھڑے ہو گئے۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

مسٹر دوبے خالی کرسی کی پشت پکڑے اپنے مخصوص قہقہے لگا رہے تھے۔

"اچھا سُنیئے" سیلیا نے تالی بجا کر تھیٹر کے مینیجر کی طرح سب کو متوجہ کر کے کہا۔ تھوڑی دیر کیلئے کھیل بالکل اور ہم میں تبدیل ہو گیا۔ نُور اپنی کرسی والی بھورے بالوں والی دُبلی حسینہ سے کچھ جھک کر کہہ رہے تھے اور اُس نے ہنس کر آہستہ سے قہقہہ اٹھایا، نور سیدھے کھڑے ہو گئے۔ اس عرصہ میں مَیں نے کھیل کے قواعد بھی سُنے۔ مگر دیکھا کہ خالی کرسی والا آنکھ کے اشارے سے دوسری کرسیوں پر بیٹھی ہوئی مُورتیوں کو بلاتا ہے اگر اس کے پیچھے والا ذرا ہوشیار نہ ہوا اور عین وقت میں اسے پکڑ نہ لے تو وُہ خالی کرسی پر نظر آتی ہے اور خوب غُل پڑتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نُور کی بھورے بالوں والی لڑکی دُوبے کے سامنے کرسی پر آ بیٹھی، اُن کے بے ہنگم قہقہے سُن رہی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔

"بھئی سب کو خالی کرسی والے کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے" نُور نے کہا اور اپنی سیاہ پلکوں کو جھپکایا۔ نور نے آہستہ سے بائیں آنکھ کے کونے کو دبایا۔ اور اِس سے قبل کہ سیلیا اُٹھے۔ اس کے زبردست ساتھی نے اسے جکڑ لیا۔ سب پھر خاموش بیٹھ گئے۔ نور نے پھر اشارہ کیا۔ لیکن شاید مجھے۔ مَیں نے بچھے پڑے ہوئے قالین کے نقش و نگار کو گھُورنا شروع کیا۔

نور بولے "مسٹر دُوبے! یہ کھیل کے قانون کے خلاف ہے کہ خالی کرسی پر کوئی ......" راجہ صاحب تو جیسے سو رہے تھے۔ وُہ شاید بالکل ہی کھیل کو سمجھنے کی کوشش نہ کر رہے تھے۔ اور جب میں اُٹھ کر نُور کی کرسی پر بیٹھی۔ تو وُہ ویسے ہی قریب والی کرسی پر بیٹھی ہوئی لیڈی ڈاکٹر سے اپنی بہو کی بیماری پر پُرزور مباحثہ

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کر رہے تھے۔ میں کھیل کے خلاف تھی۔ مگر شریک رہی۔

تھوڑی ہی دیر میں کھیل میں جان پڑ گئی۔ مسٹر مختار کی کرسی خالی ہوئی۔ تالیوں اور قہقہوں نے کان پھاڑ دیئے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"مختار صاحب، بری خالی ہوئی، یہ تو۔ ہی۔ ہی۔ ہی....." دوبلے ہنسے۔ سب جیسے مختار صاحب کو چھیڑنے پر تلے ہوئے تھے۔ کوئی اپنا ساتھی دینے کو تیار نہ تھا۔

"نانا صاحب"! ایک موٹے سے انجینئر صاحب اپنی کرسی کو خالی ہونے سے روکتے ہوئے بولے۔ "مختار اس کی دوستی نہیں"!

اور جیسے ہی میں اٹھنے لگی۔ نور نے جھپٹ کر پکڑ لیا۔

"اوہو۔ آپ سمجھیں میں سو رہا ہوں ـــــ خوب"!

میں خاموش بیٹھ گئی۔ بھورے بالوں والی سے باتیں کرنیکی کچھ تلافی ہو گئی۔

"معاف کیجیے گا گستاخی مگر آپ نہیں جا سکتیں۔ جب میری باری تھی تب تو آپ جیسے دیکھ ہی نہیں رہی تھیں ـــــ" نور پھر مجھے روک کر بولے۔

میں اور نور تھوڑی ہی دیر میں باتیں کرنے لگے۔ اس نے بتایا کہ نیلی یعنی بھورے بالوں والی لڑکی نے بتایا ہے۔ کہ میں بھی ٹینس کھیلتی ہوں۔ میں نے ان کی ٹینس کی دعوت بالکل بیخبری میں قبول کر لی۔ چونکہ میں بڑے غور سے یہ دیکھ رہی تھی کہ وہ شاید نیلی سے میرے ہی متعلق پوچھتے رہے ہوں گے۔

نیلی سے ملنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ کس قدر روشن دماغ ہے۔ اس نے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

مجھے دُوبے کے یہاں ٹینس کھیلتے دیکھا تھا۔ مجھے فخر تھا کہ مجھے وُہ یاد رکھ سکی۔

رات بھر مَیں دعوتوں، سبز قمیصوں اَور ٹینس کے اُلجھے سُلجھے خواب دیکھا کی ۔۔۔ شام کو خود نور کار لے کر آ گئے۔ میں ڈیڑھ گھنٹے سے تیار بیٹھی تھی۔ میں شاید زندگی میں بہترین کھیل کھیلی۔ کم از کم نور کا تو یہی خیال تھا۔

نور نے باقاعدہ ایک ٹینس کلب قائم کر دیا۔ سیلیا اور دو چار بیفکرے ممبر بنے۔ بڑی تگڑی فیس رکھی گئی۔ مگر ادا کرنے کی نوبت ہی نہ پہنچی۔ چند ہی روز میں سارے ممبروں کو روگ لگنے شروع ہو گئے۔ سیلیا کو سخت زکام ہو گیا۔ ایک دوسرے صاحب کو ضروری کاموں کی بھرمار رہنے لگی۔ مگر ہم دونوں جی چھوڑ کر کھیلتے ۔۔۔ روز کھیلتے ۔۔۔ تینوں کھیلتے۔

نور کس قدر دلچسپ انسان ثابت ہوئے۔ ہم گھنٹوں بکواس کرتے۔ اور ذرا جی نہ اُکتاتا۔ انہوں نے کئی خوبصورت اَور کارآمد کتابیں دیں، اِن کے تحفوں سے جی گھبرا گیا۔ میری کئی تصویریں اُن کے پاس بڑی کی ہوئی رکھی تھیں۔ لیکن بچوں کی طرح چھپائی ہوئی۔ اَور جب میں نے دیکھ لیں تو باتیں بنانے لگے۔

مسٹر دُوبے کس قدر شوقین طبیعت تھے، انہیں اپنی شادی کا دن منانے کا جنون تھا۔ اَور اُوپر سے ہوا بیٹا۔ زبردست دعوت دے ڈالی اَور سیلیا کو پہلے سے ہی لینے کے لئے، بھیج دیا۔ میں نے شام کو نور کے ساتھ ٹینس کا پختہ وعدہ کر لیا تھا۔ آج وُہ آٹھ دن بعد دَورے سے چڑھے ہوئے جب لوٹے اور یہ

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

معلوم ہوا کہ مَیں دُوبے کے یہاں ہوں تو تن تناتے آئے۔ "آپ اپنے وعدے تو خوب یاد رکھتی ہیں؟" وُہ کڑوا منہ بنا کر بولے۔

"ارے سیلیا اِدھر ــــ یہ رہی تمھاری سہیلی"۔ دُوبے میرا کندھا ہلا کر چلائے اَور بات کاٹ دی اور سیلیا مجھے وہی بیوقوفوں والا چَو کھٹے کا کھیل کھلانے لے گئی۔ مجھے موقعہ بھی نہ مِلا کہ نور صاحب کا مزاج پوچھوں۔

"تم نیلی سے تو ملی ہو؟" مَیں نے چوکھٹے میں گولی گھما کر کہا

"کون نیلی پنیر؟ ہاں شش بیوقوف ہے وُہ"۔ سیلیا گولی تاکتی ہوئی بولی۔

"کیوں کیا کی اُس نے بیوقوفی؟" مَیں نے پوچھا۔

"ارے چلیے تم کو کچھ معلوم ہی نہیں ــــ یہ نور صاحب"۔

وُہ ہکلا گئی۔ کیونکہ نور جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر پر سوار تھے۔ اور تیکھی چتونوں سے گھور رہے تھے۔ ہم چپ ہو کر کھیلنے لگے۔

"اگر آپ گھر جانا چاہیں تو کار حاضر ہے"۔ نور نے اسی روٹھے انداز سے کہا۔

"ضرور بشرطیکہ آپ پہنچا آئیں"۔ مَیں نے ہنسی روک کر کہا۔ اِن کی روٹھی ہوئی شکل اَور بھی دِلچسپ ہو گئی تھی۔ ہم خاموش روانہ ہو گئے۔ نور اُسی طرح منہ پھلائے بیٹھے رہے۔

"بہت غصہ ہے آج آپ کو؟" میں نے اُن کو بغیر دیکھے ہی کہا۔ یونہی چھیڑنے کو۔

"کیا کہہ رہی تھی سیلیا"۔ وُہ سختی سے بولے۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"کچھ نہیں — آپ آ گئے — اور وہ"....نور نے ایک لمبی سانس لی۔ انہوں نے مجھے خود ہی بتا دیا۔ کہ انہیں اس ذکر سے کیسی نفرت ہے نیلی سے انہوں نے کبھی کوئی غرض نہ رکھنی چاہی مگر وہ نہ جانے کیوں پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اور یہ — یہ اس قسم کی باتیں ہی اس کی شان میں بڑی کوفت دیتی ہیں۔

"مگر اس میں بچوں کی طرح چڑنے کی کیا بات ہے؟ آپ لڑکی تو ہیں نہیں۔ جس کے لئے دوسرے کا پسند کرنا بھی موٹی سی گالی ہے۔"

"ہوں" انہوں نے طنز یہ ہونٹ سکیڑ کر کہا۔ "اچھا چھوڑو گی بھی اب اس قصّے کو!" وہ ایک دم اکتا کر بولے۔

"کل شام کو کہاں تشریف لے جانے کا ارادہ ہے؟ اگر تکلیف نہ ہو تو — خیر وہ میچ تو پورا کرنا ہی ہے۔"

"وہی جس میں آپ ہار رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ہونہہ، ہار رہا تھا۔"

"اور کیا، گویا آپ بھول گئے؟ آپ اتوار کو ہار ہی تو رہے تھے۔"

"کونسا اتوار؟" وہ شرارت سے مسکرائے۔

"وہی جس دن مسٹر مختار کے یہاں گئے تھے۔"

"ہو گی بابا چھوڑو بھی۔" مسٹر مختار کے ذکر سے نور کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ انہوں نے کسی دور دراز رشتہ دار سے کچھ شادی وغیرہ کے سلسلہ میں مجھے بھی شریک کیا تھا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"اچھا آدمی ہے بیچارہ!"

"بہت!" طعن سے بولے۔

"کافی شاندار پارٹی تھی!" مَیں نے پھر کہا۔

"بہت!" وُہ دانت بھینچ کر ہنسے۔

"بہت اچھا ٹیسٹ ہے مکان کے بارے میں۔"

"بہوت!" نُور نے جیسے مجھے کاٹنے کیلئے منہ پھاڑ کر کہا۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد نُور نے سرمایہ داروں کو اُلٹی سیدھی سنانی شروع کیں۔ اگر ان کے پاس روپیہ ہوتا تو وُہ کبھی گورمنٹ کی غلامی نہ کرتے اور گھر بیٹھ کر قوم کی کچھ خدمت کیا کرتے۔ مَیں نے کچھ تجارت کے لئے کہا تو تمسخر اڑانے کے لئے ہنسی کو بہت روکا۔ اَور جھک کر شیشے میں سے دُور سیاہی کو گھورنے لگے۔

مَیں نے نُور کو لبھانے کے لئے کبھی بھڑکیلے کپڑوں وغیرہ کو اہمیت نہ دی تھی، مجھے جب سے معلوم ہُوا تھا کہ وُہ سفید اور سادہ کپڑوں پر جان چھڑکتے ہیں، مَیں نے ریشمی کپڑوں کو پہننا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ میرے ہاتھ میں صرف سیاہ چوڑیوں کا ایک لچھا تھا۔ باتوں کے درمیان کبھی کبھی مَیں ایک چوڑی دانستہ توڑ کر اَور اس کے ٹکڑے کر کے پھینکتی جاتی۔

"اُوہوں، کیوں توڑتی ہو؟" اُنہوں نے تازہ چوڑی توڑنے پر مجھ سے ٹکڑے چھین کر کہا۔

مَیں نے باتوں کے جوش میں پھر چوڑی توڑی۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"پھر ___ مَیں کہتا ہوں اب کے چوڑی توڑی تو سب ایک دم توڑ دُونگا" یہ کہکر اُنہوں نے زور سے میرا ہاتھ دبا یا۔ چٹ چٹ بہت سی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔

"ارے بھئی مجھے کیا معلوم تھا۔ میں نے تو یونہی ذرا پکڑا تھا۔" اُنہوں نے ہاتھ پکڑ کر کہا اور پھر چھوڑ دیا۔

"ذرا ایک کام کرو ___!" اُنہوں نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔ "ذرا بھئی سگرٹ تو نکال کر جلا دو ___ اِدھر ہے اِدھر" - وُہ ٹھوڑی سے داہنی جیب بتا کر کہنے لگے۔

جُھک کر سگرٹ کیس تک پہنچنے میں مجھے بالکل آڑا ہونا پڑا۔ میرا چہرہ جھک کر ان کے اتنا پاس آ گیا۔ کہ ان کا گرم گرم سانس بالکل کان کے پاس محسوس ہوئی ..... وُہ اَور جھکے مگر رُک گئے۔

"نکال بھی چکو" جھنجھلا کر بولے۔ اَور بے طرح اپنے ہونٹ چبانے لگے۔ ٹینس کھیلنے میں گیند مس کر کے ان کی یہی حالت ہوتی تھی۔

میں نے سگریٹ دی۔ جسے اُنہوں نے آہستہ سے دانتوں میں پکڑ لیا۔ اُنکی قربت، کپڑوں کی مخصوص خوشبو، سگریٹ کی بھینی بھینی مہک اَور خاموشی میں مِل جُل کر مجھے نیند سی لانے لگی۔ موٹر آہستہ آہستہ سرکتی اَسر اَسر رہی تھی۔ رفتار بتدریج اتنی کم ہو گئی۔ کہ مجھے کار کے رُکنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ اُنہوں نے جُھک کر میری طرف کی کھڑکی کھولی۔ تو اُن کا سر بالکل میری ناک کے پاس آ گیا۔ اور ایک دفعہ تو میں ان کے بازوؤں کے حلقے میں آ گئی۔ ان کا ہاتھ ایک لمحے کو رُک گیا ___ مگر ساتھ ساتھ

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کھڑکی کھل گئی اور میں باہر تھی...... وہ ہونٹ چبا رہے تھے۔

جب بستر پر لیٹی تو جسم ٹوٹ رہا تھا۔ ایک عجیب مسرت بھری تھکن دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی ـــ راجہ صاحب کے پوتے کی سالگرہ سے لے کر آج تک کے واقعات سینما کی تصویروں کی طرح بار بار ناچ رہے تھے۔ اُس دن اُنہوں نے ادب سے کرسی خالی کر کے دی تھی ـــ اور بھی تھے ہزاروں اس دن ـــ مختار کہاں تھے؟ ـــ بیوقوفوں کی طرح دھواں اُڑا رہے تھے اور فرنیچر کا تخمینہ لگا رہے تھے۔ مجھے نیلی کا بھی خیال آیا۔ غریب لڑکی! مجھے اس پر بہت رحم آیا ـــ بے رُخی تو دیکھو۔ ملتے تک نہیں اُسے۔ نیلی کو مجھ سے تو ملنے کا کوئی حق نہیں۔ میں نے تو نہیں کہا۔ کہ تم اس سے نہ ملو۔ ان کی عادت ہی عجیب ہے۔ کتنے مہینے ہو گئے۔ میں نے انہیں کسی لڑکی سے ملتے جلتے نہیں دیکھا۔

مجھے پھریری آ گئی۔ جب میں نے سوچا۔ کہ کیسا لگتا ہوگا۔ جب جسے چاہو وہ کسی سے محبت کرنے لگے۔ میں نے ارادہ کر لیا۔ کہ نیلی سے ملنے پر اُنہیں مجبور کیا کروں گی۔ اس کے کچھ تو زخم بھر جائیں گے۔ اور سچ کہتی ہوں اس میں غرور کا شائبہ نہ تھا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ اِس دفعہ دہلی سے ضرور انگوٹھی لے آئے ہونگے۔ یقیناً اس میں سبز نگ ہوگا جس کے چاروں طرف ہیرے جھلملا رہے ہونگے۔ اندھیرے میں مجھے اپنی بائیں ہاتھ کی چھنگلی کے پاس ہی کی انگلی تو نظر نہ

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

آئی لیکن ہیروں کا حلقہ جس کے بیچ میں سبز نگ ومک رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا۔ کچھ عجب نیم خوابی کی سی کیفیت تھی۔ دُھندلی دُھندلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھیرے لگا رہی تھی۔ اُن کا سراب بھی مجھے بالکل قریب تکیہ کے پاس جھکا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اور ایک دم سے جیسے میں ایک خوبصورت آراستہ گھر میں انتظام خانہ داری میں منہمک۔ نوکروں کو احکامات دیتی نظر آنے لگی۔ ایسی چہل پہل اور پُر نور فضا میں ایک ننھا سا بچہ جس کے بال بالکل نور کی طرح گھومے ہوئے اور گھنے تھے۔ اور ویسے ہی بھرے ہوئے خوش رنگ ہونٹ مجھے اپنے بہت قریب محسوس ہُوا۔ اور میں سوچنے لگی۔ کہ یہ کھلونا بڑا ہو کر سبز قمیص اور سفید پتلون پہن کر کتنی اچھی ٹینس کھیلے گا۔

شام کو تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی نور نہ آئے۔ میں نے چاہا۔ کچھ دیر اخبار ہی دیکھ لوں یا سویٹر ہی بُنوں۔ مگر رونالسنی ہو گئی اور جی نہ لگا۔ کہ اتنے میں نور کی موٹر کا ہارن آہستہ سے بجا۔ سَن سے جیسے کسی نے سر سے پیر تک بجلی لگا دی ——— وہی سبز قمیص اور سفید پتلون پہنے۔ گلے میں مفلر جھولتا، بڑی شان سے ریکیٹ ہلاتے جناب داخل ہوئے اور آتے ہی بے ڈھنگوں کی طرح کرسی پہ لیٹ گئے۔

" اجازت ہے ؟" وہ لیٹے لیٹے جُوتا کھولنے کا ارادہ کر کے کہنے لگے

" نہیں"۔ میں نے رعب سے کہا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"ارے بھئی یہ کیوں؟" وہ تعجب سے بھویں چڑھا کر بولے۔

"یوں"۔ میں نے نیچے بیٹھ کر ان کے جوتے کھلوائے۔

وہ آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ جیسے کسی نے اُن کے کہیں چوٹ مار دی غور سے کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے۔ پھر میری مسکراہٹ اور کھسیانہ پن پر خود ہی ہنس پڑے۔ ان کی آنکھوں سے سچی محبت ٹپک رہی تھی۔ وہ انگڑائی لے کر پوری کرسی پر لیٹ گئے۔

"ارے میرا سوٹ کیس" — انہوں نے چونک کر کہا۔

"کیسا سوٹ کیس؟" میں نے پوچھا۔ لیکن فوراً ہی مجھے دروازے کے پاس نظر آ گیا۔ میرا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ "کیا ہو گا اس میں؟" میرے تخیئل کی پھرتیلی آنکھوں نے اس میں رکھی ہوئی زریں ساڑھیوں کی تہوں میں آنکھ مچولی سی کھیلنا شروع کی۔ لیکن ابا جان اور گھر والوں کی رائے میں —— خیر چیزیں لینے میں تو انکار نہ تھا۔ مگر میری مادی آنکھوں نے سوٹ کیس کھلنے کے بعد اس میں ایک خوبصورت مردانہ نائیٹ سوٹ اور دو ایک اُلٹی سیدھی چیزیں دیکھ کر جھٹ جانا مناسب سمجھا اور کیا کرتیں؟

"کیا آپ کہیں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ ذرا حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ پھر ہنس دیئے۔ میں بھی ہنس دی۔ بولے۔ "ہاں ایک بے وقوف کے یہاں۔" اور پھر ہنسے

"تم بچے ہی ہو۔"

انہوں نے کپڑے ہٹا کر ایک قیمتی گھڑی نکال کر میری کلائی پر باندھ دی۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"آپ آخر ــــ ؟" میں نے ذرا حجّت کی۔
"تم میری ہو ــــ" انہوں نے خود مختاری سے کہا ــــ اُن کی یہ ادا مجھے بہت پسند تھی ــــ بولو !"
"مگر ابّاجان کو لکھیئے" میں نے اُن کا بازو تھام کر کہا۔
"ارے" جیسے وُہ اچھل پڑے۔
"بغیر ان کی مرضی کے شادی کیسے ہوسکتی ہے ؟" میں نے گھڑی سے کھیلتے ہوئے کہا۔
وُہ جیسے سوچ میں پڑ گئے مجھے دل میں بہت ہنسی آئی۔ عقلمند کہیں کے۔ اِس میں اِس قدر فکر کی آخر کیا بات تھی ؛ چاہے ابا جان انہیں دل سے پسند کریں یا۔
"آپ لکھیئے وُہ مان جائیں گے" میں نے ذرا اُنہ لگا کر پھر زور دے کر کہا "وُہ انکار نہیں کر سکتے"۔
"انکار" وُہ بالکل ہی چونک گئے۔
"مگر ان کی مرضی کے بغیر شادی ــــ"
"شادی ؟" اُن کے گھٹے گلے سے نکلا۔ اور میں چکرائی۔ "شادی کا کون بیوقوف ذکر کر رہا ہے ؟"
"پھر ــــ ؟" میرے پیر کانپ رہے تھے۔
"پھر ــــ پھر ــــ" وُہ ہنسے ــــ" زندگی ــــ زندگی تم جاہل تو ــــ"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"اور ـــ اور ـــ" میری زبان تالو سے چمٹنے لگی

"شادی"ـــ وہ ہنسے ـــ "یہ بیوقوفی تو میں کر بھی چکا۔

میں مجسم سوال بن کر رہ گئی۔ وہ خود ہی بولے۔ "ڈیڑھ مہینہ ہوا مجبوراً نیلی سے۔" وہ اُداسی سے ہنسے۔

اور پھر پرانا محل گرتا ہے۔ بڑھیا اپنے برتن بھانڈے اٹھالے۔ اڑ اڑ۔ اڑ ـــ وہم......"

میرے تخیل کا بے بنیاد گھروندا آڈھے پڑا۔ ایک دم پھچک سے ساری بجلیاں بجھ گئیں۔ اور اس مکروہ اندھیرے میں مجھے ایک ننھے سے بچے کی خاموش چیخیں سنائی دیں۔ جس کے بال اور ہونٹ تاریکی کی وجہ سے صاف نظر نہ آتے تھے۔

اب ان سیاہ بد صورت بچوں کی گوڈی ہیں ـــ مجھے اکثر وہی ننھا سا گھنے گھومے ہوئے بالوں اور بھرے ہوئے خوشرنگ ہونٹوں والا بچہ اپنے سے بہت قریب محسوس ہوتا ہے ـــ مگر مختار صاحب کو یہ کیا معلوم؟

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اندھے کی لاٹھی

"ڈاکٹر رشید جہاں"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ڈاکٹر رشید جہاں

تعارف۔ آپ خان بہادر شیخ عبد اللہ صاحب کی دختر۔ اور صاحبزادہ محمود الظفر کی اہلیہ محترمہ ہیں۔ یوں تو کالج کے زمانے سے آپ نے لکھنا شروع کیا۔ لیکن ۱۹۳۱ء میں باقاعدہ طور پر آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔

آپ کا شمار ہندوستان کے گنتی کے ترقی پسند ادیبوں میں ہوتا ہے۔ اپنے افسانوں میں موجودہ سوسائٹی کے عیوب اور انسانی فطرت کی کمزوریوں کو بلا جھجک بے نقاب کر دینا آپ کے طرزِ نگارش کی نمایاں خصوصیت ہے۔

"انگارے" میں آپ کے جو افسانے شائع ہوئے۔ وہ آپ کی اس خصوصیت کے مظہر ہیں۔ "عورت" آپ کی مشہور تصنیف ہے۔

آپ رسالہ "چنگاری" کو بھی ایڈٹ کر رہی ہیں۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

نواب اصغر علی اور نواب اقبال علیخاں دونوں نواب مصطفےٰ علیخاں کے پوتے تھے۔ نواب صاحب ان حضرات میں سے تھے۔ جن کو غدر کے بعد انگریزوں سے گاؤں ملے تھے۔

نواب مصطفےٰ علیخاں ان سمجھدار لوگوں میں سے تھے۔ جنہوں نے مغل سلطنت کی نہ ٹلنے والی موت کو اور انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو بھانپ لیا تھا۔ اور غدر میں کھلم کھلا انگریزوں کی مدد کی۔ سرکار نے وفاداری کے صلہ میں پچاس گاؤں جو ان کے بھائی کے تھے۔ انہیں کو دے دیئے۔ جائداد کو اور مسلمان نوابوں کی طرح نہ مصطفےٰ علیخاں نے مٹایا۔ اور نہ ان کے بیٹے علی نقی خاں نے۔ اور اب خدا کے فضل سے اتنی بڑی جائیداد پر ان کے دونوں پوتے قابض تھے۔ جتنی دونوں بھائیوں میں محبت تھی۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اُتنی ہی دونوں کی بیویوں کو ایک دوسرے سے نفرت تھی۔ بیچارے بیویوں کے معاملوں سے ہزار الگ رہنے کی کوشش کرتے لیکن کہاں تک۔ آخر ایک روز دو چولھے ہو ہی گئے۔ اقبال دُلھن چھوٹی حویلی میں اُٹھ گئیں۔ گو دونوں گھر اور چولھے الگ ہو گئے تھے لیکن پھر بھی دونوں بھائیوں کی محبت میں فرق نہ آیا تھا۔ کوئی دن ایسا نہ تھا کہ دونوں بھائی ساتھ نہ بیٹھیں۔ بیویوں کے لڑائی جھگڑوں کے باوجود کھانے پینے کا بھی یہ حساب رہا کہ اگر کھانے کا وقت ہو گیا۔ تو دونوں نے ایک ہی ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیا۔ کوئی کام ایک دوسرے کے مشورے کے بغیر نہ کرتے تھے۔ اقبال اگر بڑے بھائی پر فدا تھے تو اصغر علی بھی چھوٹے بھائی پر دم دیتے تھے۔

بڑے بھائی کے تو اللہ رکھے نو اولادیں تھیں۔ اور چھوٹے بھائی لاولد تھے۔ اقبال دُلہن کو یہ غم کھائے جاتا تھا کہ اولاد نہ ہو تو خیر لیکن جٹھانی کے طعنے اور مذاق زندگی وبال کر دیتے تھے۔ اور یہ خیال تو ان کو بیمار ہی کئے رکھتا تھا کہ میاں کی جائداد بھی اصغر دُلھن کی اولاد میں چلی جائے گی۔ وہ چھپ چھپ کر علاج کرتیں —— دعائیں مانگتیں۔ تعویذ۔ گنڈا غرضیکہ سب کچھ کرتیں۔ کہ کسی طرح ایک لڑکا ہو جائے۔ وہ ہزار پوشیدہ طور پر علاج کرتیں۔ لیکن اصغر دُلہن کو خبر ہو ہی جاتی اور وہ خوب مضحکہ اُڑاتیں۔

" ارے دولت لٹا رہی ہیں دَولت۔ ہر وقت میکے والے کھڑے رہتے ہیں الگ۔ بھک منگوں کی طرح ملانے سیانے وَیسے پڑے رہتے

ہیں کہیں پتھر میں سے خون بھی نکلا ہے کہ اب بڑھاپے میں اولاد ہو گی؟"
اصغر دلہن اتنے زور سے کہتیں کہ اقبال دلہن سُن لیں۔

اقبال دلہن جن کا میکہ نسبتاً غریب تھا اور جو ہر وقت اولاد کی خاطر روپیہ صرف کرتی رہتیں، آگ ہو جاتیں اور ذرا سی دیر میں دونوں میں طعنہ آمیز گفتگو شروع ہو جاتی کہ محفل کی رونق بڑھ جاتی۔ اصغر دلہن ہنس ہنس کر طعنے دیتیں۔ چٹکیاں لیتیں اور اقبال دلہن جھنجھلا جھنجھلا کر جواب دیتیں۔ آخر میں رونے لگتیں، منہ پیٹ لیتیں اور کوسنے کاٹنے پر اتر آتیں۔ یہ ملاقاتیں زیادہ تر دوسروں کے گھر ہوتی رہتیں۔ اقبال دلہن نے تو جٹھانی کی مخالفت کی وجہ سے سب جگہ کا آنا جانا چھوڑ ہی رکھا تھا لیکن پھر بھی کہیں نہ کہیں ساتھ ہو ہی جاتا تھا۔ اور ملاقات کے ساتھ ایسی لڑائیاں ہونا بھی ایک ضروری امر ہو گیا تھا۔

پندرہ برس کے بعد اقبال دلہن کی قسمت پھری۔ اور حمل کی علامت ہوئی۔ پہلے تو انہوں نے ڈر کی وجہ سے ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ کئی دفعہ اس قسم کے شبہات ہو چکے تھے۔ اور ہر دفعہ جٹھانی کے ہاتھ میں ایک نیا شگوفہ مذاق اڑانے کا آ چکا تھا جب ظاہر ہونے لگا تو اصغر دلہن گھبرائیں کہ کہیں سچ مچ ہی اس کے لڑکا نہ ہو جائے۔ پھر تو یہ برابر کی ہو جائے گی۔ بہت تعویذ گنڈے۔ ٹونکے کئے کہ کسی طرح حمل ضائع ہو جائے۔ لیکن اقبال دلہن کے ہو بھی زور دار تھے۔ اور ہر بلا کی روک تھام کئے دیتے تھے۔ ۹ ماہ بعد بجائے ایک لڑکے کے اللہ نے دو لڑکیاں دیں، فریدہ یا

میں شور مچ گیا۔ کوئی ایسا نہ تھا کہ مبارکباد کو نہ آیا ہو ——— اصغر دلہن کو رنج تو بہت ہوا۔ لیکن اپنے میاں کو سکھا پڑھا کر اپنے دو چھوٹے لڑکوں کا پیغام دلوا دیا۔ وہ اب بھی اونچی رہنا چاہتی تھیں۔ بیچارے اقبال خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے۔ بھائی بھتیجوں سے انہیں پہلے ہی عشق تھا۔ خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ آٹھ دس آدمیوں کے سامنے زبان دے بیٹھے۔ گھر میں جب بیوی سے ذکر کیا۔ تو وہ اپنی زچگی وغیرہ بھول کر تن کر پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ میاں کو ہزاروں سنائیں۔ "تم ہوتے کون تھے زبان دینے والے۔ بیٹیاں تو بیٹیاں ہیں اپنی چھوکریاں بھی تمہارے بھتیجوں کو نہ دوں گی"۔

گو اقبال قدرتاً کمزور آدمی تھے۔ بیوی سے ہمیشہ دبے۔ جو انہوں نے کہا کیا۔ لیکن اس بات پر وہ بھی اڑ گئے۔ "میں زبان دے چکا۔ یہ لڑکیاں تو بھائی صاحب کی ہیں۔ میں دس آدمیوں کے سامنے کہہ چکا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

اصغر دلہن نے مٹھائی بھیجی۔ باوجود بیوی کی سخت مخالفت کے اقبال نے رکھ لی۔ جو سٹر پٹر کر پھینکی۔ کنبہ اور محلے والے اقبال دلہن کو مبارکباد دیتے۔ تو وہ ناک بھوں سکیڑ کر کہتیں "دیکھا جائیگا۔ نہ میں نے منگنی کی نہ میں جانوں"۔

جب لڑکیاں ذرا بڑی ہوئیں تو اصغر دلہن کی خواہش ہوئی کہ نکاح ہو جائے۔ اقبال دلہن کہتی تھیں کہ میری زندگی میں تو ہوگا نہیں۔ اقبال کی ہمت نہیں تھی کہ نکاح بغیر بیوی کی شرکت کے کر دیتے۔ اور انہیں پوری امید

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

تھی کہ آخر میں راضی ہو جائینگی۔ غرضیکہ اسی بحث مباحثہ میں احمدی بیگم
اور قادری بیگم پندرہ برس کی ہو گئیں۔ ویسے تو جڑواں بچے زیادہ تر ایک دوسرے
سے مشابہ ہوتے ہیں لیکن احمدی اور قادری ہمیشہ ایک سے کپڑے پہنتیں اور ایک
سی صورت اور قد و قامت کے ساتھ بالکل ایک دوسری کی تصویر معلوم ہوتی تھیں اور
کبھی دفعہ ایسا ہوا کہ اقبال دلھن تک بھی دھوکہ کھا گئیں۔ گو احمدی صرف چند منٹ
بڑی تھیں لیکن قادری سے اپنے کو بڑی آپا کہلواتی تھی اور اپنی بزرگی پر
اس کو بہت ناز تھا۔ ماں کی تربیت کا اثر تھا کہ دونوں بہنیں چچی کے نام سے
کانپ جاتیں۔ انہیں قصائی سے کم نہ سمجھتیں۔ اپنے چچا کے خاندان سے انہیں
دلی نفرت تھی جب اپنی آئندہ زندگی کا خیال کرتیں تو ڈر جاتیں اور اکثر آپس
میں اس کا ذکر کرکے روتیں۔ ان کی مرضی اول تو کوئی پوچھتا ہی نہیں تھا دوسرے
کنواری لڑکیاں ہندوستانی طریقہ سے پلی ہوئی اس قسم کے الفاظ زبان پر لا ہی
کب سکتی ہیں، ماں باپ کی روز بروز کی لڑائی اپنے متعلق سنتیں اور خاموش
رہتیں۔ پندرہ سال کی ہوگئی تھیں اور اقبال دلھن کسی طرح بھی راضی نہیں ہوتی
تھیں "عمر بھر کنوارا رکھوں گی لیکن تمہارے بھائی کے گھر نہ دونگی۔ زہر کھلا کے
سلا دونگی۔ پر اصغر علیخاں کے بیٹوں کو نہ بیاہونگی"

گو کنوارا رکھنے اور زہر کھلانے کا ذکر ہر روز ہوتا تھا لیکن پھر بھی بیٹیوں
کا جہیز تیار کر رہی تھیں۔ وہ سوچتی تھیں کہ آخر کب تک اصغر دلہن بیٹوں کو
کنوارا رکھیں گی۔ ویسے ہی وہ لڑکیوں سے چودہ پندرہ برس بڑے تھے
اور اصغر دلہن کو بھی ضد تھی۔ کہ آخر ایک دادا کی جائداد ہے الگ کیوں

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ہو۔ولیو رانی کا جب دل چاہے کرے۔ مجھے جلدی نہیں ہے"۔ لڑکے بھی آئندہ امیری کے خیال سے خاموش تھے۔ اصغر علیخاں بالکل بڑھے ہو چکے تھے۔ اور بھاوج کی بدمزاجیوں اور نہیں نہیں سے تنگ آ گئے تھے۔ لیکن جائداد کا لالچ بُرا ہوتا ہے وُہ بھی اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔ جب لڑکیاں چچا کے گھر مانگی ہوں تو کس کی مجال ہے۔ کہ پیغام بھیجے۔ اور جو کسی نے ایسا ذکر بھی کیا تو اصغر دلہن سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔

احمدی اور قادری کی آئندہ زندگی کا مسئلہ یونہی کھٹائی میں پڑا ہوا تھا کہ اُن کی قسمت جاگی اور اقبال چھ روز نمونیہ میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئے۔ بیماری کے زمانے میں اصغر اور ان کی بیوی نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح نکاح ہو جائیں لیکن اقبال دلھن نے میاں کی ایسی چوکیداری کی کہ اصغر دلہن کی ایک نہ چلی۔ اور لڑکیوں کو اسی طرح چھوڑ کر باپ دُنیا سے سدھار گئے۔ اُن کی موت کے بعد حال کھلا۔ کہ وُہ زندگی ہی میں جائداد بیوی اور لڑکیوں کے نام کر گئے تھے۔ اصغر دُلہن تلملا کے رہ گئیں۔ کہ ہائے اب کیا کروں۔ اب تو یہ سونے کی چڑیاں ہاتھ سے گئیں"۔

میاں کے مرتے ہی اقبال دُلہن نے عَلمِ بغاوت بلند کیا اور بچپن کی منگنیاں توڑ دیں۔ یہ خاندانی نسل کے بچے، اصغر اور اس کا خاندان اس بات پر اڑ گئے۔ کہ یہ بچپن کی مانگ ٹوٹ نہیں سکتی۔ نکاح ٹوٹ جائیں یہ نہیں ٹوٹ سکتی۔ اگر شادی ہو گی تو یہیں ہو گی۔ ورنہ خون ہو جائیں گے۔ مجال ہے کسی کی کہ ان لڑکیوں کو بیاہ لیجائے۔ جہاں اقبال دلہن انکار شتہ لگائیں یہ

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اس کو کسی نہ کسی طرح تڑوا دیتے۔ کہیں لڑکیوں میں نقص بتاتے اور کہیں مال کو دیوانہ کہتے۔ کہیں خوشامد کرتے۔ غرضکہ دو سال باپ کو مرے ہو گئے۔ اور احمدی و قادری کا بیاہ نہ ہو سکا۔

دہلی میں مولوی سید منظور حسین ایک نہایت عقیدت مند اور عالم فقہ و شرع رہتے تھے۔ اُن کے علم اور اُن کی نیکی کی اتنی دھوم تھی کہ لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے۔ ان کے فتوے بہت اونچا درجہ رکھتے تھے۔ علمائے دیوبند تک اُن کے علم کی داد دیتے تھے۔ ایک بہت بڑی عزت اور رتبہ انہوں نے اپنا قائم کیا ہوا تھا۔ اور اسی علم قرآن کی برکت تھی کہ غریبی کے گڑھے سے نکل کر امیری کی بلندی پر پہنچ گئے تھے۔ اب مسلمانوں کے سیاسی معاملات میں بھی ان کی آواز کافی زور رکھتی تھی۔ ان مولوی صاحب کے دو جوان صاحبزادے تھے جو ابھی تک ناکتخدا تھے۔ مولوی صاحب نے جو اقبال دلہن اور اُن کی لڑکیوں کا حال سنا تو فوراً اپنے لڑکوں کا پیغام بھیج دیا۔

اقبال دلہن جو چند ماہ سے گُردوں کے مرض میں مبتلا تھیں اور زندگی کا بھروسہ نہ تھا۔ مولوی صاحب کے پیغام کو غیب کی مدد سمجھیں۔ یہ پیغام فوراً منظور کر لیا۔ چچا کو خبر ہوئی۔ وہ دہلی میں مولوی صاحب کے پاس پہنچے۔ اور اپنا حق اُن لڑکیوں پر دکھایا۔ مولوی صاحب جن کو پہلے سے سب خبر تھی۔ اور جو روپیہ کی بہ نسبت ایک رئیس کے زیادہ قدر کرتے تھے فرمانے لگے۔ "نواب صاحب مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کے خاندان میں اس قدر ناچاقی ہے۔ اس حالت میں تو یہی بہتر ہوگا۔ کہ لڑکیوں کی شادی

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کہیں باہر ہو۔ دوسرے خود میں اپنی زبان دے چکا ہوں۔ واپس نہیں پھیر سکتا۔ لڑکیاں بالغ ہیں ان کے اوپر زبردستی نہیں کیجا سکتی۔ میں نے نسبت بھیجی تھی، ان کی والدہ نے قبول کر لی۔ اگر وہ اب بھی چاہیں تو آپ سے ہاں کر دیں لیکن میں اپنی طرف سے جواب نہیں دونگا۔"

نواب صاحب جن کو بارہا کامیابیوں نے دلیر بنا دیا تھا۔ منہ کی کھا کر واپس آ گئے۔ بیوی سے ذکر کیا۔ انہوں نے گھر میں کہرام مچا دیا۔ خون کی ندیاں بہ جائیں گی —— یہ بیاہ یونہی ہو جائیں گے —— غضب ہے کہ یہ عورت مرے ہوتے میاں کی زبان کی یوں بے قدری کرے اور ہم کچھ نہ کر سکیں۔"

شادی تو ایسی حالت میں کیا رچتی۔ ہر وقت ڈر تھا کہ اصغر دلہن اور ان کے صاحبزادے کچھ نہ کچھ فساد برپا کر دیں گے۔ لہذا مولوی صاحب کی عقل نے یہ سب کام سہولت سے ادا کر دیا۔ نکاح کی تاریخ چاند کی آٹھ ٹھہری۔ بہت زور شور کی تیاریاں لڑکی والوں میں شروع ہو گئیں۔ رقعے بٹے۔ لوگ اس بیاہ کے اسی طرح منتظر تھے جیسے کہ گاؤں میں لوگ رام لیلا کے لئے رہتے ہیں۔ ۹ تاریخ کو مولوی صاحب معہ دولہاؤں اور قاضی و گواہوں کے رات کے دس بجے موٹر میں آئے۔ نکاح پڑھائے گئے۔ اور ڈیڑھ گھنٹہ بعد دولہنوں کو لے کر رخصت ہو گئے۔ اس کی خبر سوائے اقبال دلہن اور حکیمن کے جو کہ اقبال دلہن کی وفادار نوکر تھی۔ کسی کو نہ تھی۔ حکیمن بڑھیا جیسے آنکھوں سے کم سوجھتا اور کانوں سے کم سنائی دیتا تھا۔ اس

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

بیاہ سے خوش تھی۔ اور لڑکیوں کے ساتھ بھی وہی گئی۔ کیونکہ اس کے علاوہ انہیں اعتبار کس پر تھا۔

یہ شادی ایسی چپ چپاتے ہوئی۔ کہ اصغر دلہن کو دوسرے دن صبح جبکہ لڑکیاں جا چکی تھیں خبر ہوئی۔ سر پیٹ لیا۔ اور سوائے کوسنے اور کاٹنے کے کیا رکھا تھا۔

مولوی صاحب کی بیوی نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو جمع کر لیا تھا انہیں اس طرح خالی گھر میں دلھن اتارتے وہم سا آیا۔ سب کی سب پریشان تھیں۔ کہ نہ معلوم کیا ہوگا۔ جب خیر بہت سے ایک بجے موٹریں آ کر رکیں۔ اور معلوم ہوا کہ دلہنیں آگئیں تو سب کو اطمینان ہوا۔

جاڑوں کے دن تھے۔ مہاوٹیں برس کر کھل رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا کچھ کچھ ابر۔ اور کبھی کبھار بوندا باندی سردی کو اور چمکا رہی تھیں۔ بیویاں انگیٹھیاں لئے بیٹھی تھیں۔ ایسی سردی میں دلہن کو اتروانے کوئی اٹھا کوئی نہ اٹھی۔ سب کو سونے کی جلدی تھی۔ دلہنیں سیدھی اوپر بھیج دی گئیں۔ کنواری لڑکیاں ایک کمرے میں زمین پر بستر کئے آپس میں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ ایسے موقعے ان بیچاریوں کو کم ملتے تھے۔ کہ آپس میں بیٹھ کر باتیں کر سکیں۔ ایسے موقعوں پر تو وہ رات رات بھر شادی بیاہ کی باتیں کرکے گزار دیتی تھیں۔

لڑکیوں کی ماں کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ جو زیور اور کامدانی لڑکیوں کو ملے تھے۔ اس سے وہ باغ باغ تھیں۔ بیویاں رشک اور

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

حسد سے اُن کی طرف دیکھتیں اَور ظاہرا مبارکباد دے رہی تھیں۔ سب کو جماہیوں پر جماہیاں آرہی تھیں۔ "بُوا میں تو چلی۔ مارے نیند کے بیٹھا نہیں جاتا" کہہ کہہ کر کھسکتی جارہی تھیں۔ حتّےٰ کہ کمرے میں وُہ اور اُن کی بیٹی رہ گئیں۔

دونوں دُولھا اِس قسم کی خفیہ شادی سے خوش تھے۔ کیونکہ ہر ایک ان پر رشک کر رہا تھا۔ برابر والے تو چھیڑ چھیڑ کر ناک میں دم کیے دیتے تھے بڑے صاحبزادے جن کو اپنے والد کی طرح علم دین میں خاصی مہارت ہوتی جاتی تھی۔ اپنی فتح پر بہت خوش تھے۔ اپنے رقیبوں کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ اَور چھوٹے جو شاعرانہ مزاج رکھتے تھے۔ اور والد کے دِل سے اُترے ہوئے تھے۔ ایک عجیب قسم کی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ لہٰذا سب انہیں کو بنا بھی زیادہ رہے تھے۔ جب اُن کی طلبی اندر ہوئی یہ بہت شرمائے۔ لیکن بڑے بھائی کو جلتے دیکھ کر ہمت بندھی۔ اور ساتھ ساتھ لگ لیے۔ ڈیوڑھی پر چچی اَور بہنیں ملیں۔ اُنہوں نے خوب چھیڑا۔ اَور انہیں اپنے اپنے کمرے بتا کر پیچھے چلی گئیں۔ گھڑی نے ٹن ٹن چار بجائے۔ اَور چھوٹے صاحب نے انگڑائی لی۔ بیوی کو اور قریب لاکر بھینچا۔ "ارے بھئی! یہ تو بتاؤ کہ تمہاری بہن کو بھابی جان کہوں یا بڑی سالی کا رشتہ رکھ کر آپا جان کہوں؟"

احمدی جو ابھی تک شرم کی وجہ سے "جی ہاں۔ جی نہیں" میں جواب دے رہی تھی۔ ایک دم آنکھیں پھاڑ کر ڈرتی ہوئی آواز میں بولی۔ "تو آپ —— آپ ——"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

چھوٹے صاحب جن کو بڑی سخت نیند آرہی تھی۔ اور جو برابر جاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آدھی جاگتی اور آدھی سوئی آواز میں بولے:-

"ارے کہاں بھاگی جاتی ہو۔ اللہ اللہ کرکے تمہیں منایا تھا۔ اور اب تم ہو۔ کہ پھر بھاگی جاتی ہو۔"

"خدا کے لیئے ..... بتایئے آپ کون ہیں؟"

"ہائے تم بھی کیا شریر ہو ــــ تمہیں ابھی یہی معلوم نہیں ہوا کہ میں کون ہوں۔"

"آپ بڑے بھائی ہیں کہ چھوٹے۔ للہ جلدی بتایئے۔"

دلہن کی آواز کانپ رہی تھی۔ دولہا نے بھی آنکھیں کھول دیں چچی کا فقرہ کانوں میں گھوم گیا کہ "کہیں غلط کمرے میں نہ چلے جانا۔"

"کیوں؟ کیوں؟ کیا یہ فاطمہ والا کمرہ نہیں ہے؟" گھبرا کر چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ واہ یہ تو اسی کا کمرہ ہے۔ یہی کمرہ ٹھیک ہے۔ فضول مجھے ڈرا رہی ہو۔"

"میں احمدی ہوں۔ بڑی بہن۔ آپ بتایئے کہ آپ کون سے بھائی ہیں؟"

"تم جھوٹ کہہ رہی ہو۔" چھوٹے بھائی صاحب لحاف میں سے نکل پڑے۔ اور پھر دلہن کی موجودگی کو دوسری طرح محسوس کرکے اپنے کو چھپا لیا۔

"نہیں تم بہت شریر ہو۔ مذاق کر رہی ہو۔" ان کی آواز میں خوشامد

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

تھی کہ خدا کے لئے کہہ دو تم چھوٹی بہن قادری ہو۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہی۔" دلہن نے کہا۔

دونوں پلنگ پر بیٹھ گئے۔ چند لمحوں تک ایک دوسرے کا منہ ایک عجیب خوف اور پریشانی سے دیکھتے رہے۔ عقل تو گویا وہاں تھی ہی نہیں۔ احساس بھی مرچکا تھا۔ دلہن پہلے ہوش میں آئی اور پھر ہانپتے "ہائے اللہ اب کیا ہوگا؟" کہہ کر منہ چھپا لیا۔ چھوٹے صاحب پلنگ سے آہستہ اُٹھے، کپڑے پہنے اور کمرے سے نکل گئے۔ دلہن زور سے پکاری "سنیئے تو" لیکن وہ سیدھے چلے گئے اور جاکر بڑے بھائی صاحب کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ سو رہے تھے اور سمجھے کہ دیر ہوگئی۔ لوگ انہیں اٹھانے آئے ہیں۔ جھنجھلا کر اُٹھے اور دو منٹ میں تیار ہو کر باہر نکلے۔ چھوٹے بھائی کو اس طرح بدحواس دیکھ کر خیریت پوچھی۔ "بھائی صاحب...... بھائی صاحب......" آواز حلق میں پھنس گئی...... "بھائی صاحب دلہنیں بدل گئیں!"

بڑے نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔

"عورتوں سے غلطی ہوگئی۔" بڑی مشکل سے پھر چھوٹے نے کہا۔

دونوں بھائی ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

لونڈوں نے انہیں ہشیار کیا اور آہستہ آہستہ منڈیر کی طرف بڑھے۔ بڑے بھائی خاموش اور ساکت کچھ سوچ رہے تھے۔ اور چھوٹے بھائی کو ایک سیکنڈ بھی ایک جگہ قرار نہ تھا۔

"بھائی صاحب، بھائی صاحب! اب کیا ہوگا؟"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"تمہیں تحقیق ہے؟"

"خود دُلہن نے مجھ سے کہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوگا؟"

"جو ابا جان کہیں گے اور کیا۔"

"ابا جان؟"

"اور کیا؟"

"میں تو ہرگز......!"

"اچھا یہاں زینہ میں بھیگنے سے فائدہ۔ چلو نیچے چلو۔"

دونوں میں سے کسی کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ کہ واپس اپنے کمروں میں جاتے۔ آہستہ آہستہ زینہ کی طرف چلنا شروع کیا۔ زینے پر بڑے نے کہا۔ "ہر ایک سے ذکر نہ کرتے پھرنا۔ فضول میں ہنسی ہوگی۔ مجھے پہلے ابا جان سے ذکر کر لینے دو۔"

"اور جو انہوں نے بدل لینے کو کہا۔"

"پہلے ہی کیسے کہنے لگے۔ انہیں موقع تو دو۔"

چھوٹے کی حالت قابلِ رحم تھی۔ باپ کو وہ جانتے تھے۔ کہ ایک دفعہ مُنہ سے نکلی ہوئی بات کو منوا کر چھوڑتے ہیں۔ اور اس موقع پر ہنسی اُڑوانی وہ کہاں تک پسند کریں گے۔ پہلی دفعہ ایک عورت کو آغوش میں لیا تھا۔ اپنی لکھی ہوئی غزلیں سنائی تھیں۔ وہ شادی سے پہلے ہی بغیر دیکھے عاشق ہو چکے تھے۔ اور اب تو احمدی پر جان سے فدا ہو گئے جو اُن کی بیوی نہ تھیں۔ کیا کریں کیا نہ کریں۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

چھوٹے باہر سے اندر آئے۔ ڈیوڑھی میں کھڑے ہیں۔ ماں کے پاس جائیں یا نہ جائیں۔ بھائی نے منع کر دیا تھا۔ معلوم ہو گا۔ تو ناراض ہوں گے لیکن ہمت کر کے ماں کے پاس گئے۔ وہ سامنے گاؤ تکیہ سے لگی ہوئی سو رہی تھیں۔ جا کر آہستہ سے جگایا۔ اُنہوں نے گھبرا کر آنکھیں جو کھولیں۔ تو بیٹے کے منہ پر جمی کی جمی رہ گئیں۔ "اے خیر تو ہے؟"

"دُلہنیں بدل گئیں!"

"دیوانہ ہوا ہے لڑکے!" ماں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "کہاں ہیں انوری اور منجھلی دُلہن جو لڑکیوں کو اُوپر لے گئی تھیں؟ ...... انوری!" بیٹی کو زور سے آواز دی۔

"خدا کے لیئے اماں جان، بھائی صاحب نے منع کر دیا ہے۔ کہ کسی سے نہ کہنا۔ وہ ابا جان سے پہلے ذکر کریں۔ آپ بھی کسی سے میرا نام نہ لیجیئے!"

یہ کہکر چھوٹے اسی گھبراہٹ میں اُٹھ کر چل دیئے۔ اور ماں منہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

بھابی

"مسز مالتی دیوی"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

مالتی دیوی

تعارف۔ محترمہ مالتی دیوی صاحبہ مسٹر ایس۔ کے۔ ڈھبنڈہ ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ بی۔ سیکریٹری میونسپل کمیٹی پوجھانی (بدایوں) کی اہلیہ ہیں۔ آپ کے اکثر افسانے ملک کے بڑے بڑے مشہور ہندی رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

علاوہ دیگر خصوصیات کے آپ کے افسانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جب انہیں اردو رسم الخط میں لکھ دیا جائے تو یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ یہ ہندی میں نہیں بلکہ ہندوستانی میں لکھے گئے ہیں۔ آپ کا افسانہ "بھابی" جو اس کتاب میں شریک کیا گیا ہے۔ اسی نوع کا افسانہ ہے۔ رسالہ 'ایشیا' میں غالباً آپ کے متعدد افسانے شائع ہو چکے ہیں۔

آپ کے افسانے ادبی دنیا میں بہت قدر اور وقعت کے ساتھ دیکھے جاتے ہیں۔ انقلابی افسانوں کی طرف آپکا زیادہ رجوع ہے۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"سریش! سُن تو۔ اِدھر آ تو سہی!"

"کیا ہے بھیّا؟ دُلہن سے کہہ دو نا!"

سریش کمرے کے باہر کُتّے کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھا۔

گجندر نے پھر زور سے بلایا "سنتا نہیں ہے؟"

"آ تو رہا تھا" کہتے کہتے کھلاڑی سریش بھائی کے پاس آ کھڑا ہوا۔

دھیرے سے گجندر نے پوچھا "سریش ٹھیک ٹھیک بتانا۔ ہاں بتا تو وہ کیسی ہے؟"

"کون وہی لڑکی جسے ہم دیکھنے گئے تھے؟ بھیّا سچ کہتا ہوں بڑی سندر ہے۔ خوب گوری ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں ہیں اور وہ میری طرف دیکھ کر ہنستی تھی۔ ماں کہتی ہیں وہ میری بھابی لگے گی۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

گجندر کی ہمت افزائی سے متاثر ہو کر بچے نے تعریفوں کے پُل باندھ رکھے تھے۔ کہ اِسی عرصہ میں ماتاجی آتی دکھائی دیں۔ گجندر نے

CC-0 In Public Domain. Digitized by eGangotri

جلدی سے بات بدل کر پوچھا۔
"اپنا سبق یاد کر لیا تھا نا؟"
"ہاں ہاں" کہتا ہوا پیچھا چھڑا کر سریش کُتّے کو ساتھ لیکر بھاگ کھڑا ہوا۔

پندرہ برس کی بھولی بھالی بہو نے حسن اور نزاکت کی دیوی بن کر گھر کی لکشمی کی جگہ لے لی۔

ماتا نے سریش کو آواز دی۔ "کیوں رے سریش! بھابی سے بولتا نہیں ہے؟" سریش شرما سا گیا۔

یہ چار سال پہلے کی تارا نہیں ہے جسکو بڑے چاؤ سے وُہ بھیا کیلئے دیکھنے گیا تھا۔ اور گھر آکر اس نے کہا تھا کہ وہ اسکی طرف دیکھ دیکھ کر ہنستی ہے۔ بھیا کے پوچھنے پر گھنٹوں جس کی خوبصورتی کے وُہ پل باندھ دیتا تھا۔ اب وہ تارا اُس کے لئے بالکل بدل گئی تھی۔

نیچی نظر کر کے اس نے آواز دی "بھابی!"

تارا نے دیکھا کہ اب وہ چار سال پہلے والا سریش نہیں ہے۔ بالکل بدلگیا ہے۔ اب اسکی جگہ اٹھارہ اُنیس برس کا ایک فیشن ایبل نوجوان آکٹ کھڑا ہو۔

بھابی کے جواب میں وہ صرف مسکرا دی۔

سریش نے اس مسکراہٹ میں وُہی چار سال قبل والی ہنسی کے جذبات پائے آہستہ آہستہ یہ جھجک جاتی رہی

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ایک دن بیوہ ماتا نے چنچل سریش کا ہاتھ تارا کو پکڑا کر "دیکھو تارا میرا لاڈلا بیٹا سریش دکھی نہ رہے"۔ پھر سریش کو یہ کہکر "دیکھو بھابی کو خوش رکھنا" اور اسی طرح کی کتنی ہی باتیں سمجھا کر آخری ہچکی لے اِس سنسار سے چل بسی۔

بھابی کی محبت کو پا کر سریش ماں کی موت کا گھاؤ بھول سا گیا۔ چھ مہینے کی جانی پہچانی بھابی سے وُہ اتنا ہِل مِل گیا جیسے اُس سے پچھلے جنم کی جان پہچان ہو۔ گجیندر بھی اکثر دونوں کو سمجھاتا رہتا۔ تارا سے کہتا کہ سریش کا خیال رکھنا اور سریش سے کہتا کہ بھابی کو خوش رکھنا۔ اُسے دونوں کی فکر تھی۔ پچیس چھبیس سال کا گجیندر ابھی سے بڑا پن آ گیا تھا۔ اتنی دولت کا مالک ہوتے ہوئے بھی وُہ نیک نفس تھا۔ سریش کالج سے لوٹ کر آتا اور آواز دیتا۔ "تارا بھابی"۔ تارا ہنستی ہوئی خوبصورتی کی شمع کی مانند سامنے آتی دونوں ایکدوسرے کے پاس بیٹھتے سریش اپنی ساری تھکاوٹ بھابی کی محبت بھری باتوں میں بھول جاتا۔ پھر ہنس مکھ گجیندر آتا۔ تینوں مل کر کھاتے پیتے اَور گھومنے چلے جاتے۔

"بھابی بھابی" سریش نے پکارا۔ پر تارا کمرے میں نہ تھی یکا یک سریش کی نگاہ چوکے میں بیٹھی ہوئی بھابی پر پڑی۔ دھوئیں کی وجہ سے تارا کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں اور چہرہ بھی سرخ اور مرجھایا سا تھا۔ سریش نے دھیرے سے کہا "بھابی"۔ تارا کی نگاہیں قصوروارانہ انداز سے نیچی ہو گئیں۔ سریش نے پوچھا "مہاراجن کہاں گئی؟" تارا نے نظریں نیچی کر کے کہا۔ "وُہ چار دن کی چھٹی ......

"ہوں تو یہ بات ہو؟ شاید دُنیا کی سب مہاراجنیں مر گئیں" بڑبڑاتا

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ہُوا سرلیش آگے بڑھا۔ چار قدم آگے بڑھکر پھر لوٹا۔ اَور کہنے لگا۔ "اپنے وعدہ کے مطابق سینما کیلئے تیار ہو؟"

ڈرتے ڈرتے تارا نے جواب دیا۔ "پر کھانا......؟"

"بھابی آج بازار سے کھالیں گے" کچھ دیر بعد طنزیہ انداز میں بولا "شاید آج سب حلوائی بھی مر گئے ہیں۔ لو مَیں پہلے اُن کا ماتم کر آؤں۔ کیوں ٹھیک ہے نا بھابی!"

تارا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے سرلیش کی آنکھوں میں امارت کا نشہ دیکھا۔

کھانے کے وقت گجندر نے پوچھا۔ "تارا تمہاری اَور سرلیش کی تھالی؟"

تارا نے جواب دیا۔ "وُہ مجھ سے ناراض ہے۔ اگر میں کھا لونگی۔ تو میرے سر چڑھ کر وُہ کئی دِن نہ کھائے گا۔"

گجندر کھانا کھا کر چلا گیا۔

تارا سرلیش کے کمرے کی طرف بڑھی۔ وُہ سینما نہیں گیا تھا۔ اور اسی طرح سوٹ پہنے کرسی پر پاؤں پھیلائے آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ تارا نے آہستہ سے آواز دی۔ "سرلیش کھانا کھالو" پر سرلیش اسی طرح آنکھیں بند کئے پڑا رہا اور تارا لوٹ آئی۔

وُہ لوٹ تو آئی پر جُوں جُوں وقت بیتتا گیا۔ اُس کا دھیان سرلیش کی طرف کھچتا گیا۔ "اُف آج وُہ بھوکا ہے، ناشتہ بھی تو اُس نے نہیں کیا۔"

سرلیش چھت پر پلنگ کا سہارا لئے کھڑا تھا۔ تارا آگے بڑھی۔ سرلیش کے ہاتھوں کو پکڑ کر بولی۔ "کیوں پریشان کرتے ہو؟"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"بھابی مجھے بھوک نہیں ہے نیچے چلی جاؤ۔"

تارا نیچے لوٹ آئی۔ اتنا روکھا پن۔ وہ چاہتا ہے کہ اسکی بھابی کچھ کام ہی نہ کرے۔ واہ رے پیار! تارا نے اپنے دل میں کہا۔

سریش نے تارا کو یوں لوٹتے دیکھا تو اور بھی غصے سے بھر گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ تارا اس کی اور خوشامد کرے۔

سریش نے سنا کہ تارا نوکر سے کہہ رہی ہے کہ "کھانا اٹھا کر رکھ دے مجھے بھی بھوک نہیں ہے۔"

سریش چونکا۔ "اُف تارا بھوکی ہے۔ اُسے تارا کی بھوک نا قابل برداشت معلوم ہوئی، وہ اپنی بھوک برداشت کر سکتا تھا۔ مگر تارا کی نہیں۔ رات کے نو بجے وہ نیچے اترا۔ تارا آنگن میں آنکھیں بند کئے پلنگ پر پڑی تھی، سریش نے بڑے شیریں لہجے میں کہا۔ "بھابی!" پر تارا اسی طرح پیٹھ موڑے پڑی رہی۔ سریش نے آہستہ سے تارا کو ہلایا۔ "بھابی سچ کہتا ہوں کل مہتر اور مہری دونوں کو جواب دے دونگا۔ پھر تو خوب کام کرنا۔ اگر اب کبھی تو کہیں جانے کو کہے گی۔ تب بھی نہ لے جاؤنگا پر اب اُٹھ کر کھانا کھا لے۔"

آخرکار سریش نے اپنی روٹھی ہوئی بھابی کو دونوں ہاتھ پکڑ کر بستر پر بیٹھا دیا۔ پھر بھی تارا چپ تھی۔ سریش نے آخری ترکیب استعمال کی۔ "میں تمہارا کون ہوں جو میرا کہنا مانو گی۔" تارا جھٹ اٹھ بیٹھی اور کہنے لگی "سریش میرے متعلق ان الفاظ کو کبھی نہ دُہرانا۔ میں کیا تمہاری نہیں ہوں؛ بھابی کی جگہ ایک پیار کرنیوالی بھابی ہوں۔ ماتا کی جگہ ماتا ہوں گرو کی جگہ گرو۔ بہن اور سب سے زیادہ سریش تمہاری دوست ہوں۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

تمہارے سکھ کی چاہنے والی، تمہارے دُکھ سکھ کی ساتھی، سمجھے سریش ؟"

تارا کی آنکھوں میں پوتر پریم کی چمک تھی۔ سریش اسکے سامنے احترام سے جھک گیا۔ اسی وقت گجیندر بھی آ گیا۔ اُس نے تارا کے آخری الفاظ سنے تو بے اختیار اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے "عورت محبت کا مجسمہ ہے"۔ پھر تینوں نے ساتھ ساتھ کھایا۔

اسی طرح سریش بچوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر بھابی سے لڑتا روٹھتا پھر بھی بھابی کے بغیر اُسے ایک دِن چین نہ تھا۔

ایک دِن ہنسی ہنسی میں تارا پوچھ بیٹھی۔ "سریش جب میں اور تیری بہو لڑا کرینگی تو تم کس کا ساتھ دو گے ؟" الہڑ سریش اُٹھا۔ ایک بڑا سا پتھر دکھا کر بولا۔" اگر وہ تجھ سے لڑیگی تو اِسی سے اُس کا سر توڑ دُونگا۔ تارا خوش ہو کر بولی۔ "بھابی کی اتنی طرفداری ؟"

سریش کی کتنی ہی سگائیاں آنے لگیں۔ پر تارا کملا پر بہت ریجھ گئی۔ یہاں تک کہ خود ہی شادی کرنے کا وعدہ بھی کر آئی۔

تارا سریش کے کمرے میں گھسی۔ سریش نے دیکھا۔ کہ اُس کی بھابی آج بہت خوش ہے۔ اُس نے پوچھا۔ "بھابی! آج کھِلی کیوں پڑتی ہو ؟"

"سریش میں تمہاری ہونے والی بیوی کو دیکھ آئی ہوں۔ وُہ ہے بھی تمہارے ہی لائق۔ بہت خوبصورت بہت سوشیل"......

گھبرا کر سریش نے بیچ ہی میں ٹوکا۔ "بھابی!"

تارا گھبرا گئی۔ اس نے دیکھا۔ کہ سریش کے چہرے پر ہلکی سی اداسی چھا گئی ہے۔ تارا نے بہت محبت سے اس کے کندھوں پہ اپنی نازک

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

پتلی باہوں کو ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں کیا ہوا؟"

" بھابی وُہ تم سے لڑے گی۔ تین جنوں کی اس چھوٹی سی سندر بستی میں خلل پیدا ہوگا۔ بھابی بھول جاؤ اپنے سریش کے بیاہ کی بات"— سریش کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

تارا پھر بھی ہمت کر کے بولی۔ "بھابی کی امیدوں پر پانی مت پھیر و اب وُہ ایک خوبصورت دوشیزہ کے ہاتھ سے اس گھر کو سجوانا چاہتی ہے"۔ تارا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

" سریش میں اس آرزو کو اتنے دن سے دل میں چھپائے ہوئے تھی"۔ سریش بھابی کے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہنے لگا۔ "بھابی ماں نے مرتے وقت کہا تھا کہ بھابی کو خوش رکھنا۔ پر کیا وُہ مجھے اپنی ماں کے اس حکم کا پالن کرتے دیکھ کر خوش ہوگی۔ وُہ لڑکی بھابی تو میں کیسے سہونگا"۔

سریش اَن مناسا کمرہ چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد نہ جانے کیا سوچ کر لوٹا اور کہنے لگا۔ "بھابی تم کیا واقعی یہی چاہتی ہو؟"

تارا آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اُسی طرح کھڑی تھی یہ سوال سُن کر مڑی۔ سریش اُس کے بالکل پاس کھڑا تھا۔ تارا جوش میں آ کر بولی۔ "کہدو ہاں اپنے لئے نہیں میرے لئے۔

شادی کے دنوں میں تارا کی پھرتی دیکھ کر سب دانتوں تلے اُنگلی دباتے سریش تعجب سے اپنی ۱۸۔۱۹ سالہ خوبصورت بھابی کی پھرتی کو دیکھتا اور

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

تارا کے ڈانٹنے پر فوراً ذرا سی بات پر ڈرا تا کہ "میں شادی نہیں کرونگا"۔ تارا من ہی من میں خوش ہوتی لیکن بظاہر غصّہ دکھا کر کہتی "اب تمھاری بہو گھر میں آ گئی ہے پھر بھی لڑتے جھگڑتے ہو"
تارا طرح طرح سے کملا کی خاطریں کرنے لگی۔

تارا باہر کی آئی ہوئی ساڑھیاں وغیرہ تہ کر رہی تھی کہ اس نے دُور سے درد بھری آواز سنی ـــــ "بھابی!" ـــــ وہی جانی پہچانی آواز ہے پر اتنی درد بھری کیوں؟ وہ باہر کی طرف دوڑی۔ اُس نے دیکھا۔ کہ اس کا لاڈلا سریش بچوں کی طرح دروازہ سے سر ٹکائے کھڑا ہے۔ تارا نے گھبرا کر پوچھا "کیا ہوا؟"
"تم اتنی خوش کیوں ہو؟" بچوں کی طرح سریش نے پوچھا۔
"پاگل خوشی کی ہی بات ہے۔ کملا جیسی لکشمی میری دیورانی بنی ہے۔" تارا نے ہنس کر جواب دیا۔
تم بھولنی ہو بھابی! پھر مجھے الزام مت دینا۔" سریش دُکھ بھرے لہجے میں بولا۔
"کیا ہوا سریش؟" تارا نے تعجب سے سوال کیا۔
"وقت آنے پر تم خود سمجھوگی بھابی! پھر اپنے سریش کو کبھی ملزم نہ بنانا۔ وعدہ کرو" یہ کہتا ہوا سریش اُٹھ کر چلدیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
کچھ ہی دنوں میں تارا نے محسوس کیا۔ کہ سریش کا کہنا ٹھیک تھا۔ کملا جیسی دیکھنے میں تھی ویسی دل کی نہیں۔ وہ بڑی تنگی اور آنکھ میں اُنگلی ڈال کر لڑتے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

والی ہے۔ تارا اپنے سریش کا مستقبل سوچکر گھبرا گئی۔

ایک دن صبح سویرے سے تارا کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ سریش بھی بڑا متفکر تھا۔ شام ہوئی تو کملا آکر بولی۔ گھومنے چلو"۔ سریش نے دھیرے سے جواب دیا۔ "تارا بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے"۔

"مجھے معلوم ہے" رُوکھے پن سے کملا نے جواب دیا۔ "پر میں تو چل رہی ہوں"۔

"کل چلیں گے۔" سریش نے جواب دیا۔

کملا نے تنک کر کہا۔ "یہ کیوں نہیں کہتے کہ تارا جی کے بنا نہیں جاؤگے۔ ان کے بنا تمہیں ......"

"چپ رہو کملا۔ جاؤ یہاں سے، میرا وقت ضائع نہ کرو"۔

"میں تو چپ رہتی ہوں۔ پر جب بھابی سے میٹھے باتیں کرتے ہو تب کیا وقت ضائع نہیں ہوتا؟"

سریش کو غصہ آگیا۔ پر وُہ غصّے کو پی کر بولا۔ "کملا چار جانوں کی چھوٹی سی لبستی۔ اس میں بھی یہ حسد اور جلن؟"

کملا منہ بنا کر بولی۔ "ہُوں تمھیں میری خوشی کی کیا پروا، تم تو صرف تارا کو ......"

سریش کرسی سے اُٹھ کر بولا۔ "چپ رہو کملا۔ نہ تو تم تارا ہی کو سمجھتی ہو اور نہ مجھے پہچانتی ہو۔ ماتا نے مرتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ بھابی کو خوش رکھنا۔ تب ہی سے میں تارا کو دُنیا کی سب عورتوں سے زیادہ چاہتا ہوں۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

میرے من مندر میں قابلِ پرستش اپنی بھابی کی مورتی ہے۔ اور آج سے میں تمہیں صاف بتا دیتا ہوں۔ کہ اسی دیوی کی مہربانی سے تم میری بنی ہو۔ اور اسی کی وجہ سے میں تمہاری عزت کرتا ہوں"۔

کملا ناگن کی طرح پھنکار کر بولی "ہُوں"۔

اس "ہُوں" نے سریش کے زخموں پر نمک چھڑک دیا۔ اُس نے پلیپر ویٹ اٹھا کر کملا پر دے مارا۔ غصہ سے بھری کملا "اچھا دیکھ لونگی۔ یہ سب تارا کا قصور ہے"۔ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

اُدھر سے گزرتے ہوئے تارا نے کملا کے آخری الفاظ سنے۔ وہ چونکی پر پھر کچھ سوچ کر کمرے میں آئی۔ سریش غصہ میں بھرا بیٹھا تھا۔ تارا نے پیار سے چھوٹی بہن کی طرح سریش کے ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "سریش تم نے یہ کیا کیا؟"

محبت کی اس مورتی کو سامنے پا کر سریش کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہو گیا۔ اور وہ کہنے لگا۔ "بھابی میں نے اس پر پیپر ویٹ پھینکا تھا۔ کیونکہ وہ تمہارے خلاف بک رہی تھی"۔

"سریش اگر اُس نے میری بابت کچھ کہا تھا تو میں اس سے نپٹ لیتی یہ شادی میں نے کرائی ہے تم نے نہیں کی۔ پھر کملا ابھی بچہ ہے"۔

سریش کہنے لگا۔ بچی ہے۔ ہُوں۔ دیکھنے میں تو تم سے بڑی معلوم ہوتی ہے البتہ لڑنے میں تم سے بڑھ گئی ہے۔ جھوٹی سچی لگانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ پھر چھوٹی کس بات میں ہے۔"

"سریش اس پر رحم کرو۔ میری خاطر تمہیں اُسے منانا ہی پڑے گا"۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"بھابی تمھارا یہی حکم ہے؟"

"ہاں"۔ آنسوؤں کے بوجھ سے دبی ہوئی پلکوں کو اُٹھا کر تارا بولی۔

تارا کے دل میں فکر نے قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ وُہ کملا کو پیار کرتی۔ سمجھاتی۔ مناتی۔ جو وُہ کہتی۔ اُسے اُسی دم پورا کرتی۔ پر لڑاکی کملا ہر ایک بات کا الٹا مطلب نکال لیتی۔ تارا کملا کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی۔ صرف یہ سوچ کر کہ وہ اُس کے نیکدل دیور کی بیوی ہے اور ادھر سریش کملا کو صرف اسی لئے چاہتا۔ کہ تارا کی یہی مرضی ہے۔

خوش مزاج تارا کملا کو خوش کرنے کیلئے نئی نئی چیزیں بنا کر کھلاتی۔ اگر کبھی سریش بھابی کو چوکے میں بیٹھے دیکھ لیتا۔ تو منہ پھُلا کر پہلے کی طرح پوچھتا۔

—"تمہاری مہاراجن مر گئی ہے کیا؟"

تارا ہنسکر کہتی۔" چل پاگل کیوں۔ بچاری کو مارتا ہے"۔ وُہ آگے بڑھ کر بھابی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے چوکے سے گھسیٹ لاتا۔ گجندر ہنستا پر کملا کی آنکھوں میں حسد کی آگ دیکھ کر ڈر جاتا۔

وقت گزرتا گیا۔

سیدھا سادا سریش ایک بڑی خوبصورت ساڑھی لایا اور آج سے دو برس پہلے کی طرح اُس نے لاپروائی سے وُہ ساڑھی تارا کو دی اور کہا۔

"بھابی! اِسے کل ضرور پہننا۔ نہیں تو نہ بولوں گا۔"

تارا نے بھی تعریف کرتے ہوئے ساڑھی بڑے چاؤ سے رکھ لی۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کملا حسد کی آگ سے جل اُٹھی۔

دوسرے دِن کملا سے سریش نے محبت سے پوچھا۔ "کیوں کملا ساڑھی کیسی لگی ؟"

"مجھے کیا معلوم ؟" کملا نے بگڑ کر جواب دیا

سادہ دِل سریش نے پھر پوچھا۔ ایک ایسی ہی تمہارے لئے لے آؤں ؟ بھابی کی پسند تو میں جانتا ہوں پر تمہاری پسند ٹھیک طور پر معلوم نہیں ہے۔"

"بھابی کو کھلے گی"۔ کملا نے طعنہ دِیا۔

"کیا کہا ؟" سریش نے تیزی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں" !

"کچھ کہا تو تھا"

سریش کا غصّہ برابر بڑھتا جا رہا تھا۔

"جو تم نے پوچھا تھا۔ اُس کا جواب دِیا تھا۔ کملا نے منہ بنا کر کہا۔

سریش بگڑ کر بولا "بے ڈھنگی جنگلی کہیں کی"

تو ان کے پاس جاؤ۔ جہاں تہذیب اور ڈھنگ ہو۔"

سریش بے چین ہو کر کمرے سے نکلا۔ اُدھر سے تارا کچھ چینی کے پیالے اور طشتریاں لئے آ رہی تھی۔ سریش آگے بڑھا اور تارا کے ہاتھ سے پیالے چھین کر دُور پھینک دیئے۔ تارا ڈر گئی۔ بھابی کے نازک کندھوں کو سریش زور سے جھنجھوڑ کر کانپتا ہوا بولا۔

"بھابی! اب کیا حکم دیتی ہو۔ تم حکم دیتی گئیں میں تعمیل کرتا گیا۔ پر تم نے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کبھی حکم دینے کے بعد سوچا بھی۔ مَیں نے شادی کی۔ زہریلے پھول کو سونگھا پر صرف تمھارے لئے ـــــ تمھاری خوشی کے لئے ـــــ تم نے میری شادی کرکے میری دُنیا اُجاڑ دی ـــــ جلد باز بھابی! تم نے کتنی جلدی کی۔ نہ خود سوچا اور نہ مجھے سوچنے کا موقع دیا۔"

ڈھیٹ عورتوں کی طرح تارا بولی۔ "جاؤ اسے منانا ہی ہوگا۔"

نہیں جاؤں گا بھابی! وُہ کہتی ہے وہیں جاؤ جہاں تہذیب اور ڈھنگ ہو۔ اسلئے وہیں آیا ہوں۔ اب نا امید نہ کرو!"

تھوڑی دیر تک وہ ایک کمزور بچے کی طرح اپنی ماں جیسی بھابی کا سہارا لئے کھڑا رہا۔ پھر کپڑے پہن کر باہر چلا گیا۔

" میری کملا! تمھاری تارا، تمھارے ہی سکھ میں سُکھی رہنے والی تارا تم سے ایک درخواست کرتی ہے۔"

" کیا کہتی ہو،" کملا نے روکھے پن سے پوچھا۔

" میری سندر کملا تم مجھ سے لڑا کرو۔ پر میرے دیور کا لحاظ کیا کرو۔ میں نے ساس جی کے مرنے کے بعد اُسے دِل کے خون سے پالا ہے ـــــ"

تارا کا گلا بھر آیا۔

کملا تنک کر بولی۔" ہاں میری وجہ سے اب تمھاری سونے کی دُنیا اُجڑ گئی ہے۔ تو میرے ساتھ اُس کی شادی ہی کیوں کرائی تھی؟"

تارا اپنے غصے کو چھپا کر بولی۔" کیوں کروائی تھی۔ کیونکہ مَیں چاہتی

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

تھی کہ سریش کی پتنی آئے۔ میں تمھارا خوبصورت رنگ روپ دیکھ کر تم پر ریجھ گئی۔ جو کچھ کیا وہ میں نے کیا سریش نے نہیں کیا۔ پھر بھی تمہیں پا کر میں خوش ہوں۔ کملا! تم بھی خوش رہو۔" تارا کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

"ہاں ٹھیک ہے تم اپنی دُنیا بساؤ۔ میں اپنی الگ بساؤنگی۔" کملا نے جواب دیا۔

تارا نے اس جواب کو خوب اچھی طرح سمجھا۔ اس کا سر جھک گیا۔ اور آنکھوں سے آنسوؤں کی دو بوندیں ٹپک پڑیں۔ کواڑ کے پیچھے سریش کھڑا تھا۔ اُس نے سب کچھ سن لیا۔ اب اس کا چپ چاپ کھڑا رہنا کٹھن ہو گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ طعنہ باز کملا یہاں تک پہنچ جائے گی۔

دھیرے دھیرے وہ کمرے میں گھسا۔

اُس کی طرف دیکھے بغیر تارا کمرے سے نکل آئی۔

"کملا! تم اپنی دُنیا الگ بسا لو — پر یاد رکھو۔ میری۔ بھیا اور بھابی کی دنیا ایک رہے گی۔"

کملا طوفان کی طرح گرج کر بولی۔ "اپنے کمرے اور الماریوں کی تالیاں لو۔ میں ان کی رکھنے والی کون ہوں۔"

یہ کہکر جوں ہی اُس نے اپنا بڑا صندوق کھولا۔ وہ بھونچکی سی رہ گئی۔ سریش بھی آگے بڑھا۔ اُس نے دیکھا کہ جو ساڑھی اس نے تارا کو لا کر دی تھی۔ وہ کملا کی نئی ساڑھیوں میں رکھی ہے۔

سریش نے کملا کو ہلا کر کہا۔ "یہ دیکھ اپنی جیٹھانی کی محبت!"

CC-0 In Public Domain. Digitized by eGangotri

کملا کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔ پر گلاب کی چکنی پنکھڑیوں پر اوس کی بوندیں کب تک ٹھہر سکتی تھیں۔

سریش کے دوست شارو نے گھر بھر کی دعوت کی۔ سریش نے دوست سے گھر والوں کا تعارف کرایا۔ وہ تارا کو پکڑ کر بولا —— "شارو۔ یہ میری بھابی ہے۔ جس کی میں سب سے زیادہ عزت کرتا ہوں۔ میں اپنی بھابی کو پرانوں سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔"

اُس وقت سریش کی آنکھوں میں بہشتی محبت کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ گجندر اور شارو دونوں بہت متاثر ہوئے۔

سریش پھر سنبھل کر بولا۔ "شارو یہ میری پتنی کملا ہے۔" شارو اور گجندر نے محسوس کیا۔ کہ کملا سے تعارف کراتے وقت وہ کچھ تھکا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔

کملا جل بھن کر کباب ہو گئی۔

سردی کے دن تھے —— رات کو سب گھر لوٹے۔ تارا کپڑے بدل کر کرسی پر بیٹھی ہی تھی کہ سریش آ گیا۔

"بھابی کچھ کھانے کو دے۔ میرا کھانا تو سب ہضم ہو چکا۔" یہ کہکر جوں ہی وہ بھابی کو اٹھانے لگا۔ وہ چونک کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ جیسے بجلی کی لہر سے اُس کا ہاتھ چھو گیا ہو۔

"بھابی! انہیں کیا ہوا ہے؟"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"کچھ نہیں سریش"! تارا لاپروائی سے ہنس کر بولی۔
"جھوٹ بولتی ہو بھابی! تمہارا جسم تو جل رہا ہے۔ تمہیں بخار ہے"۔

تارا کا بخار بڑھتا گیا۔ سریش اور گجیندر دونوں دُور دُور سے ڈاکٹر ول کو لائے۔ پر کسی دوا سے تارا کو فائدہ نہ ہُوا۔ سریش رات دن بستر کے پاس بیٹھا رہتا۔ گجیندر اُسے سمجھاتا کہ دیکھو سریش تمام رات نہ جاگا کرو۔ نہیں تو تم بھی بیمار ہو جاؤ گے۔ پر سریش ایک منٹ کے لئے تارا کے پاس سے نہ ہٹتا اُسے ..یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی اس کی تارا کو پکڑنے کے لیے آ رہا ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح تارا کے پاس بیٹھا بیٹھا کہتا —— "مجھے تارا سے کون چھین سکتا ہے؟"

سریش کبھی کبھی ڈاکٹر کو ڈانٹتا۔ "بڑے بنے ہیں ڈاکٹر۔ جی میں آتا ہے تمہاری سب دواؤں کو پھینک دُوں۔ کیا آپ لوگ بھابی کا ذرا سا بخار بھی نہیں اُتار سکتے"؟ پھر ایک دم گھبرا کر کہتا۔ "میرا سب کچھ لے لیجئے۔ پر تارا کو اچھا کر دیجئے"۔

تارا آہستہ سے کہتی —— "مَیں اچھی ہو جاؤں گی سریش!"

سریش رو کر کہتا۔ "تم مجھے پرچا رہی ہو"؟

کملا پریم کا سوانگ بھر کر کہتی۔ "آپ کیوں اتنے پریشان ہوتے ہیں۔ کیا جیجی کے ساتھ ہی جانے کی ٹھانی ہے"؟

سریش بگڑ کر کہتا۔ ہٹ جا سامنے سے مطلبی۔ تمہاری لڑائیوں کی

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

وجہ سے ہی میری بھابی کی یہ حالت ہوئی ہے۔"

ایک دِن تارا کی طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ اُس کے چہرے پر ایک ہلکی سی بہشتی شگفتگی نظر آنے لگی۔ اُسے دیکھ کر سب کو بڑی تسلّی ہوئی۔ سریش بھابی کی گرم پیشانی پر ہاتھ پھیر کر خوشی سے بولا۔ " بھابی تم اب اچھی ہو جاؤ گی۔"

تارا دیور کے ہاتھوں کو محبت سے تھام کر بولی۔" سریش تمہیں یاد ہے۔ پہلے تم ایک گانا اپنی رُوٹھی ہوئی بھابی کو منانے کے لیے گایا کرتے تھے :۔

مت بھابی سے پریم بڑھانا
جیتے جی مر جانا
پل پل میں ہے رُوٹھنے والی
مت اس سے نین لگانا
جیتے جی مر جانا !
جادُو گرنیوں کی ہے رانی !
مت اُس سے پریم بڑھانا

"سریش ! اب آگے یاد نہیں آتا۔ تمہیں وُہ بات یاد ہے۔ کتنے برس بیت گئے۔ جب تم ابھی چھوٹے سے تھے۔ اور اپنے بھیا کے لئے مجھے پسند کرنے آئے تھے۔ ہا۔ ہا ــــ تم نے بھیا سے آ کر کہا تھا۔ کہ مَیں تمھاری طرف دیکھ دیکھ کر ہنستی ہوں۔ شیطان !" ــــ پھر تھوڑی دیر رُک کر بولی۔" سریش

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اُس دِن میں وعدہ کرنے پر بھی سینما نہیں گئی تھی۔ تم رُوٹھ گئے تھے پاجی کہیں کے ——— تم بھول گئے۔ اس دِن تم نے مجھے کتنے زور سے جھنجھوڑا تھا"——— یہ کہہ کر تارا کے چہرے پر ایک ڈر کا سایہ سا دَوڑ گیا۔

گجندر چونکا۔ کہ تارا کے چہرے پر شگفتگی کیوں آ گئی ہے۔ اِس کی بول چال آج اِتنی صاف کیوں ہے۔ اور اُسے یہ پرانی باتیں کیوں یاد آ رہی ہیں؟

گجندر نے آواز دی۔ "سریش حالت ٹھیک نہیں"

سریش پاگلوں کی طرح اُٹھا ——— "ہاں بھیّا بجھنے سے پہلے چراغ کی روشنی تیز ہو جاتی ہے"

یہ کہہ کر وُہ پھوٹ کر رونے لگا۔

گجندر نے آواز دی۔ "تارا!"

سریش جھکا۔ "تارا بھابی!"

تارا نے ایک دفعہ آنکھیں کھولیں۔ اُس کی پُتلیوں میں گجندر اور سریش چمک اُٹھے۔ پھر کملا کو دُعا دینے کے لئے ہاتھ اُٹھے۔ "کملا! خوش رہنے کی کوشش کرو!" پھر ایک بار پتلے پتلے پیلے ہونٹ ہلے "پریتم!" آنکھوں کی پُتلیاں آخری بار گجندر کی طرف پھیر کر ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

سچ مچ بجھنے سے پہلے چراغ زیادہ روشنی دے کر بجھ ہی گیا ——— چِتا روشن ہو کر بجھ بھی گئی۔ سریش ٹکٹکی باندھ کر چِتا کے دھوئیں کو دیکھتا رہا۔ اس دھوئیں کے بیچ میں سے اُسے تارا اُوپر اُٹھتی دکھائی دی۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

چھت پر کھڑا سریش اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آہستہ سے گجندر نے پوچھا۔ "کیا دیکھتے ہو سریش"! یہ کہہ کر گجندر رونے لگا۔

سریش نے انگلی اوپر اٹھا کر کہا۔ "وہ دیکھو بھابی"!

گجندر سریش کو نیچے پکڑ لایا۔

کملا بولی۔ "تم کہاں جاتے ہو"؟

سریش بگڑ کر بولا۔ "جہاں ڈھنگ ہے۔ جہاں پیار ہے۔ وہاں جاتا ہوں"۔

کملا رو کر بولی۔ "میری طرف دیکھو"!

سریش دکھی ہو کر بولا۔ "اب شاید کبھی نہ دیکھوں گا۔ کملا! تمہیں بھابی کتنی امیدوں سے بیاہ کر لائی تھی۔ پر تم نے اس کے ننھے سے پریم بھرے دل کو چور چور کر دیا۔ کملا! تم نے میری بھابی کو نہیں پہچانا۔ جس دن سے تم بیاہی آئیں۔ وہ تمہارے طعنوں کے نوکیلے تیروں سے چھدتی ہی گئی۔ اور پھر بھی وہ تمہیں پیار کرتی تھی۔ تم میری بیوی ہو یہ سوچ کر"۔

"تارا بھابی! ——— تارا"! یہ کہہ کر سریش کمرے سے نکل بھاگا۔

"بھیا! سچ کہتا ہوں۔ بڑی سندر ہے۔ گوری ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں ہیں ——— بھیا! وہ میری طرف دیکھ کر ہنستی ہے۔ ماں کہتی ہے۔ وہ میری بھابی لگتی ہے"۔

گجندر نے اٹھ کر اپنے پیارے بھائی کو چھاتی سے لگا دیا۔ دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کے دلوں کی دھڑکن کو صاف صاف سنا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

دو دُکھی دِلوں کی دھڑکن ایک ساتھ ہو کر اور بھی تیز ہو گئی —— "دھک دھک - دھک"۔

" چھوڑ دو - چھوڑ دو بھیّا!" کہکر سریش الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا - اور پھر آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھا کر بولا۔

" وُہ دیکھو بھیّا دُھواں —— بھیّا وُہ بھابی جا رہی ہے - بھیّا دیکھو دیکھو بھابی جا رہی ہے"

پھر وُہ چھت پر زور زور سے ٹہل کر پکارنے لگا :-

تارا بھابی —— تارا بھابی —— او میری تارا بھابی!"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

وُہ اُسکی کون تھی؟

"شانتی دیوی"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

مسز شانتی دیوی

تعارف۔ آپ ہندی کی ایک مشہور افسانہ نگار خاتون ہیں۔ آپ کے افسانے زیادہ تر ہندی کے مشہور رسائل "مایا" اور "چاند" میں شائع ہو کر ہندی کے خوش ذوق ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔

آپ اپنے افسانوں میں زیادہ تر زندگی کے تلخ حقائق کو وا شگاف کرتی ہیں۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

(۱)

ساڑھے نو بجے رات کا وقت تھا۔ سینما ہال کے سامنے والی سڑک پر کافی چہل پہل تھی۔ کچھ لوگ اشتیاق کے ساتھ چلے آ رہے تھے اور کچھ فلم پر تنقید کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ پرمودھ اور شیلا ابھی سینما دیکھ کر نکلے۔ اور شیلا نے تانگے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کچھ بھی ہو۔ پرمودھ بابو، پریم کا جو بلند نظریہ اس تصویر میں دکھایا گیا ہے۔ وہ قابلِ تعریف ہے، انتہائی قابلِ تعریف! اس بارے میں اور باتیں پھر ہونگی۔ کل آپ چائے پر ہمارے یہاں آ رہے ہیں نا؟"

"ضرور! آپ ......" اچانک کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "پرمودھ!"

اور پرمودھ نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ نریندر کھڑا تھا۔ مسکرا کر ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "خوب ملے بھائی! اچھے تو ہو؟"

شیلا کا تانگہ چل پڑا۔ پرمودھ کو اس سے کچھ اور کہنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس لئے وہ دل ہی دل میں نریندر پر جھنجھلا اٹھا۔ ملنا ہی تھا

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

تو کچھ دیر ملتے۔"

نریندر نے کہا۔ "گھر جا رہے ہو نا؟ آؤ میرے تانگے پر بیٹھ جاؤ راستے میں باتیں ہونگی۔"

پرموَدھ چپ چاپ اس کے تانگے پر بیٹھ گیا اور تانگہ روانہ ہوا۔

نریندر نے کہا۔ "بہت دِنوں بعد ملاقات ہوئی۔ کہو اچھے تو ہو؟ یہاں کب سے ہو؟"

"میں تو یہاں کئی مہینے سے ہوں۔ کالج میں مجھے جگہ مِل گئی ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے۔ بڑی خوشی کا مقام ہے۔ ہاں تو گھر کے سب لوگ بھی یہیں ہونگے؟"

"میرے گھر میں ہے ہی کون؟"

"کیوں ناشکری کرتے ہو؟ شریمتی جی کیا ہوئیں؟"

"وُہ ——" پرموَدھ نے سرد آہ بھری سے کہا۔ "وُہ میکے میں ہیں۔"

"میکے؟" نریندر نے حیرت زدہ ہوکر کہا۔ "میں نے تو سُنا تھا۔ وُہ تمھارے ساتھ ہیں!"

"کِس سے سنا تھا؟"

نریندر ہنس پڑا۔ بولا۔ "یہ بھی بتانا پڑے گا؟ ارے سیٹھ میرے پھوپھا لگتے ہیں۔ ابھی انہیں کے یہاں سے تو آ رہا ہوں۔"

"جب تو تم سب کچھ جانتے ہو۔ میں کیا بتاؤں؟"

"آخر مالتی ہے کہاں؟"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"وہیں گھر پر سکول میں پڑھتی ہے۔"

"کیا یہاں سکول نہ تھا؟"

"تو میں اُسے یہاں اپنے ساتھ لے آتا؟"

پرموَدھ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو تم؟ دُنیا مجھے کیا کہتی کہ خود تو تعلیم اور تہذیب لوگ کے اتنے حامی اور بیوی صاحبہ کو سوسائٹی میں ملنے جلنے کی کون کہے۔ زبان تک کھولنے کی تمیز نہیں۔ اسے یہاں لاکر ساتویں جماعت میں داخل کرا کے اپنی حماقت کا ڈھنڈورا پیٹتا؟"

"آخر اُسے کب تک اِس طرح باہر رکھو گے؟"

"جب تک وہ سوسائٹی میں ملنے جلنے کے قابل، کافی مہذب، روشن خیال اور تعلیمیافتہ نہیں ہو جاتی۔"

نریندر نے مسکرا کر کہا۔ "یہ تو اچھی قید رہی۔ اچھا تم یہاں اپنے آپ کو شادی شدہ بتایا کرتے ہو یا غیر شادی شدہ؟"

پرموَدھ ہنس پڑا۔ بولا۔ "بھئی ہم لوگ عورتیں تو ہیں نہیں کہ بالوں میں لگے ہوئے سندھور یا پاؤں میں پڑے ہوئے چھلے سے کوئی ہمیں شادی شدہ سمجھ سکے۔ ہم تو جیسے شادی شدہ ویسے ہی غیر شادی شدہ۔ شادی شدہ بتلانے سے لوگوں کی طرف سے بیوی کے متعلق سوالات کی بوچھاڑ کے خوف سے میں اپنے لئے غیر شادی شدہ بننا ہی زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔"

"جب تو تمھارے پاس بیاہ کے لئے روز نئے نئے پیغام آتے ہونگے" نریندر نے ہنسکر پوچھا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"ہاں یہ بھی یہاں کی ایک خوبی ہے۔ میں نے کتنی ہی بار کہا۔ کہ میں بیاہ نہیں کرونگا۔ لیکن لوگوں پر جیسے کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔"

نرِیندر نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ "پر مودھ! تم نے اچھا نہیں کیا۔ تمہیں کیا حق ہے کہ لوگوں کو اس طرح دھوکے میں رکھکر خواہ مخواہ ان کے پیسے وقت اور محنت کو ضائع کراؤ۔"

"میں کیا کروں؟ وہ لوگ خود ایسا کرتے ہیں۔ لیکن بھئی اس میں بھی بڑا مزہ آتا ہے۔"

"مزا آتا ہے؛ جب تو بڑی مشکوک بات ہے۔ کہیں کچھ کا کچھ نہ ہو جائے۔" نرِیندر نے مذاق کے لہجے میں قدرے مسکرا کر کہا۔

"پرمودھ اس کے مذاق کو نہ سمجھ سکا۔ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "تم مجھے بالکل بیوقوف سمجھتے ہو۔ کہیں ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ ہندو ولاء میں تو طلاق کا قانون ہی نہیں ہے۔"

"قانون نہ ہونے سے کیا؟ قانون اور سماج کی روک تو عورتوں کے لئے ہوتی ہے مردوں کے لئے نہیں۔ مردوں کو کس بات کی روک ہے؟"

"یہ تو درست ہے لیکن کم از کم میں تعددِ ازدواج کو اچھا نہیں سمجھتا۔ تم میری جانب سے مطمئن رہو!"

"ایشور کرے ایسا ہی ہو۔ اچھا تمہارے ساتھ یہ دیوی جی کون تھیں؟"

"پروفیسر گپتا کی چھوٹی بہن مس شیلا!"

"پروفیسر گپتا۔ وہ تو نئے خیالات کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ بہن کو

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اکیلے ہی سیلنما دیکھنے بھیج دیتے ہیں۔"

"اکیلے کیوں ہیں جو ساتھ تھا۔"

"تمہاری ان لوگوں سے گہری دوستی ہے"؟

"کچھ کچھ۔"

نریندر خاموش ہو گیا۔

پرمودھ نے کہا۔ "چپ کیوں ہو گئے"؟

"کچھ نہیں۔ میں سوچتا تھا۔ کہ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو کیا کرتا۔"

"کیا کرتے تم؟" اس نے ہنس کر پوچھا۔

"یہی تو ابھی تک سوچ نہیں سکا۔ خیر کچھ بھی ہو۔ میری رائے ہے کہ ایسی صورتِ حال میں تمہیں خاص طور سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔"

پرمودھ زور سے ہنس پڑا۔ نریندر نے قدرے ناراض ہو کر کہا۔ "تم میری بات کی ہنسی اڑاتے ہو۔"

"نہیں بھائی معاف کرو۔ میں تمہاری بات پر غور کروں گا۔ کوچوان! اسی سامنے والے بنگلہ میں تانگہ لے چلو (پھر نریندر سے) ابھی تو تم یہاں رہو گے نا؟"

"ہاں ایک ہفتے تک"

تانگہ رکا۔ پرمودھ اتر کر بولا۔ "پرسوں شام کو میرے ہی یہاں چائے پینا۔ پھر مل کر سیر کو چلیں گے۔"

"اچھا گڈ نائیٹ!"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"گڈ نائیٹ!"

(۲)

پروفیسر گپتا نے اپنے بیٹے سچیندر کی پہلی سالگرہ کے موقعہ پر اپنے منتخب احباب کو دعوت دی تھی۔ کچھ مہمان آچکے تھے۔ اور کچھ ابھی آرہے تھے۔ مسز گپتا اپنی فطری مسکراہٹ کے ساتھ سب کا استقبال کررہی تھیں۔ اتنے میں مسز چوہدری تشریف لائیں۔ مسز گپتا پیشوائی کو دروازے تک جاکر انہیں نہایت عزت واحترام سے اندر لائیں۔ معمولی بات چیت کے بعد مسز چوہدری نے کہا۔ "مسز گپتا! مجھے ایک بات کا بہت شکوہ ہے۔"

مسز گپتا مسکرا کر بولیں۔ "سچ"؟

"ہاں، سنا ہے شیلا کا بیاہ ٹھیک ہوگیا اور تم نے مجھے خبر تک نہیں دی"۔

"کون کہتا تھا ——— ؟ آپ کو اطلاع دیئے بغیر بیاہ طے ہو جائے گا؟ ابھی تو کہیں بات ہی نہیں ہوئی۔ بیاہ کہاں طے ہوگیا؟"

"سچ؟" مسز چوہدری نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ "لیکن شہر بھر میں لوگ کہتے ہیں کہ شیلا کا پرمودھ جی کے ساتھ ....."

"سب لوگ ایسے ہی کہتے ہیں۔" مسز گپتا نے درمیان ہی میں بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ہماری نظر شروع ہی سے ان پر رہی ہے۔ لیکن بیاہ صرف ایک ہی فریق کی مرضی سے تو نہیں ہوتا"؟

"کیا پرمودھ جی کو شیلا سے رشتہ کرنے میں کوئی اعتراض ہے"؟

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"پتہ نہیں۔ گپتا جی کو تو آپ جانتی ہی ہیں۔ اپنے سماج کی لڑکیوں کی طرف سے شادی کی گفتگو کرنا انہیں کتنا ناپسند ہے۔ مَیں نے اس جانب کئی بار اشارے کئے ہیں۔ مگر پرمودھ جی نے ابھی تک کچھ کہا نہیں۔"

"اچھا یہ بات ہے۔ کہاں ہیں پرمودھ جی، گرونا! ذرا بلانا تو انہیں مَیں خود اُن سے پوچھوں گی۔ دیکھتی ہوں کیسے وہ کچھ نہیں کہتے۔ لیکن دیکھو بیاہ ٹھیک کرا دیا تو منہ میٹھا کرانا پڑیگا۔"

"ارے یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟ آج ہی لو۔ ابھی لو۔ ٹھیک تو ہو جائے ——— ملے پرمودھ جی؟ ابھی یہیں تو تھے۔" یہ کہتی ہوئی مسز گپتا پرمودھ کی تلاش میں چلی گئیں۔

ادھر پرمودھ کی تلاش ہو رہی تھی اور اُدھر وُہ گپتا کے بنگلے سے نکل کر تیزی کے ساتھ اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ لیکن پرمودھ کو سانس لینے کے لئے وُہ بھی ناکافی معلوم ہوتی تھی۔

دوسرے دن پروفیسر گپتا کو پرمودھ کا ایک خط ملا۔ لکھا تھا۔

پیارے گپتا جی!

کتنا اچھا ہوتا کہ مَیں جس موضوع پر یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اس پر قلم اُٹھانے کے لئے مجھے کبھی مجبور نہ ہونا پڑتا۔ لیکن اپنے ہی ہاتھوں اپنی ہی احمقانہ غلطی سے خود کو اور آپ لوگوں کو جس کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے اس کا ازالہ تو کرنا ہی پڑیگا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"میں مجرم ہوں۔ آپ کے آپ کے خاندان کے اور بالخصوص مس شیلا کے نزدیک بے حد قصور وار ہوں۔ میں نے ڈھونگ سے، فریب سے شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو ابھی تک سب سے غیر شادی شدہ بتایا۔ میں نے ایسا اس لئے نہیں کیا تھا کہ اس ذریعے سے میری رسائی لوگوں کے گھروں تک ہو جائے بلکہ میرا مقصد اس سے بالکل ہی مختلف تھا۔ آج سے دو سال پیشتر میرا بیاہ سیٹھ پنا لال کی بھتیجی مالتی سے ہو چکا ہے۔ مال و دولت کے لالچ میں میرے مرحوم والد نے میری مرضی کے خلاف یہ رشتہ کر دیا۔ جہالت اور جاہلانہ رسوم و عقاید کی فضا میں پرورش پانے کے باعث مالتی میرے لئے موزوں ثابت نہیں ہو سکی۔ وہ اس وقت گھر پر ہائی سکول کی ساتویں جماعت میں پڑھ رہی ہے۔ اور چونکہ یہ بات میرے لئے انتہائی باعث شرم و ندامت ہے کہ میری بیوی مالتی ایسی غیر تعلیم یافتہ۔ جاہل اور غیر مہذب لڑکی ہو۔ اسلئے میں نے اپنے آپ کو غیر شادی شدہ ظاہر کیا۔ میں نے کبھی خواب میں بھی یہ خیال نہ کیا تھا کہ اس کے ذریعے میرے سب سے زیادہ عزیز احباب کو نقصان پہنچے گا۔ لیکن جو سوچا تھا۔ وہ نہ ہوا۔ آپ لوگوں کی بڑھتی ہوئی محبت کے پیش نظر دوستی کے سوائے اور بھی کوئی جذبہ جگہ پا سکتا ہے۔ یہ میں اتنے دنوں تک کبھی وہم و گمان میں بھی نہ لا سکا۔ لیکن جو کچھ میں نہیں دیکھ سکا۔ وہی دنیا نے دیکھا اور جو کچھ میں نہیں سمجھ سکا۔ وہی دوسروں نے سمجھا۔ اور جب کھلے لفظوں میں کہا تو میری آنکھیں کھلیں۔ خود کو اور آپ لوگوں کو بھی اس کشمکش میں مبتلا کرنے کا ذمہ وار میں ہی ہوں۔ لیکن اس وقت اس قدر پریشان و بدحواس

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ہو رہا ہوں کہ مجھے اپنا فرض سمجھ میں نہیں آتا۔ کاش جس رُوپ میں مجھے دنیا نے دیکھا۔ وہی میرا حقیقی رُوپ ہوتا۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ مالتی کے لئے میرے دل میں کوئی جگہ نہیں۔ ہندو سماج کے رواجی بیاہ کے بندھنوں میں بندھ جانے کے باعث مجھے اپنے آپ کو شادی شُدہ اور اُسے اپنی بیوی کہنے کے لئے مجبور ہونا پڑ رہا ہے۔ ہندو قانون میں طلاق نہیں ہے۔ میری زندگی تو تباہ ہو ہی چکی ہے۔ مجھے فکر ہے تو مس شیلا کی رسوائی کی۔ میں نے تمام صورتِ حالات وضاحت سے آپ کے سامنے کھول کر رکھدی ہے اب آپ ہی بتلایئے کہ میں کیا کروں؟

افسوس ہے کہ عزیز سچیندر کی پہلی سالگرہ کے جشن میں شمولیت کے ارادے سے آپ کے مکان پر آکر بھی اس میں مناسب حصہ نہ لے سکا۔ اُسے اپنی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہوں؟

حیران و پریشان — پرمودھ

مسز گپتا نے خط پڑھا تو غضبناک ہو کر بولیں۔ "بڑا فریبی نکلا۔ شادی شدہ ہی تھا تو اُسے شیلا ..."

پروفیسر گپتا نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے متفق نہیں — رامناتھ سے کار نکالنے کے لئے کہو۔"

عین اُسی وقت اُن کی چھوٹی بہن لیلا نے آکر پوچھا۔ "بھیا! کہاں جایئے گا؟ چوک؟"

"نہیں، میں پرمودھ کے یہاں جا رہا ہوں۔"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

"پرمودھ جی کے یہاں ؟ وہ تو صبح کی گاڑی سے اپنے گھر گئے ہیں"۔

"سچ ؟" گپتا نے حیرت سے پوچھا۔ "تمہیں کیونکہ معلوم ہوا ؟"

"میں اسٹیشن کی طرف ٹہلنے گئی تھی تو راستے میں ملے تھے۔ بڑی جلدی میں تھے۔"

پروفیسر گپتا آہستہ آہستہ اپنے دار المطالعہ میں چلے گئے۔ اور ایک کے بعد دوسرا سگریٹ جلا کر پرمودھ کے یکایک گھر چلے جانے کا باعث سوچنے لگے۔

(۲۴)

"بہت دنوں بعد نظر آئے ہو پرمودھ جی! کہاں چلے گئے تھے" مسز گپتا نے پرمودھ کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

"گھر چلا گیا تھا۔" پرمودھ نے قدرے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ کا خط پاکر میں آپ کے گھر جا رہا تھا کہ لیلا نے بتایا۔ آپ گھر چلے گئے ہیں۔ کوئی ضروری کام تھا؟" پروفیسر گپتا نے پوچھا۔

"ضروری ہی سمجھیے۔ والٹف کو دیوانے کتے نے کاٹ لیا تھا۔"

"اوہ"۔

پرمودھ نے درمیان ہی میں کہا۔ "میں نے جو کچھ آپ کو خط میں لکھا تھا اس میں اب ایک بات اور بڑھا لیجیے۔ مالتی کو دیوانے کتے نے کاٹ لیا ہے میں اسے کسولی پہنچا کر اپنے ایک دوست کی دیکھ بھال میں چھوڑ آیا ہوں لیکن حالت نازک ہے بچنے کی زیادہ امید نہیں۔"

"بچنے کی زیادہ امید نہیں سچ مچ؟" مسز گپتا نے اشتیاق آمیز لہجے میں پوچھا۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

" خیال تو یہی کیا جاتا ہے۔ بدن پر کئی ایک زخم ہو گئے ہیں۔ ابھی تک دیوانگی کے آثار تو ظاہر نہیں ہوئے لیکن بخار کی وجہ سے کمزور بہت زیادہ ہو گئی ہے ۔۔۔۔ رخصت نہ ملنے کے باعث میں ڈاکٹری معائنہ تک کسو لی نہیں ٹھہر سکا۔ دوسرے ڈاکٹروں کی رائے میں حالت اچھی نہیں ہے ۔"

" جب تو ہم آپ سے کچھ امید رکھ سکتے ہیں ۔" مسز گپتا نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

" ایشور نے آپ پر بڑی عنایت کی ۔" لیلا ہنس کر بولی۔

" میں ہندو سماج کے ان سب جھنجھٹوں کو نہیں مانتا ۔" پروفیسر گپتا نے قدرے تیز لہجے میں کہا ۔" پرمودھ جی ! اگر آپ فی الحقیقت شیلا سے بیاہ کرنا چاہتے ہیں تو میں صرف اسی بہانے سے کہ آپ کا بیاہ ایک دفعہ ہو چکا ہے آپ کو اس کے ناقابل قرار نہیں دے سکتا۔ آپکی بیوی کا زندہ رہنا یا مر جانا اس بارے میں کم از کم میرے نزدیک یکساں ہے ۔ میں اس بیاہ کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا۔ جو فریقین میں سے کسی ایک کی خواہش کے خلاف کیا گیا ہو۔ اس طرح سماج کے بنائے ہوئے جھوٹے بندھن کے نام پر اپنی زندگی کی راحتوں کا بلیدان کے اس کے لئے آٹھ آٹھ آنسو بہانا ہندو سماج کی سب سے بڑی بھول ہے۔ میں اسے کمزوری کہتا ہوں، بزدلی کے نام سے پکارتا ہوں ، ہندو لاء میں یقیناً طلاق کا قانون نہیں ہے لیکن ہم جرأت سے خواہش کے خلاف کیئے ہوئے بیاہ کی حقیقت میں یقین رکھنے سے انکار کر دیں تو دنیا کی کوئی طاقت بھی ہمیں ایسا کرنے سے نہیں روک سکتی۔ اسکے علاوہ دل نہ ملنے پر علیحدگی کی اجازت قانون اور سماج

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ہیں سب جگہ موجود ہے۔ لہٰذا اگر آپ اپنی موجودہ شادی میں خوش نہیں اور اگر آپ یہ سوچتے ہیں کہ شیلاؔ سے بیاہ کرکے آپ کا مستقبل روشن ہوجائیگا۔ تو میری طرف سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں۔"

پرمودھ کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔ اُس نے گپتا کے ہاتھ پکڑ کر نرم آواز میں کہا "میں اپنی ممنونیت کا اظہار کِن الفاظ میں کروں، آپ اِتنے روشن خیال وسیع القلب بلند حوصلہ ہونگے مجھے اسکی امید نہ تھی۔"

"اِس میں ممنون ہونے کی کوئی بات نہیں۔ آپ میرے دوست ہیں اور شیلا میری بہن۔ اِس سے بہتر خوش قسمتی کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

"تو رِشتہ پختہ سمجھا جائے؟" مسز گپتا نے مسکرا کر پوچھا۔

"ضرور!" پرمودھ نے جواب دیا۔

"یہ کام جلد ہی ہوجانا چاہیئے پرمودھ جی! ہم لوگ رخصتیں ہوتے ہی پہاڑ پر چلے جائیں گے۔ اِس سے پہلے ہی آپ شیلا کا بار سنبھال لیں تو بہتر ہے۔"

"آپ درست فرماتی ہیں لیکن مالتی کی بیماری کا نتیجہ بھی دیکھنا تو ضروری ہے۔"

"یہ بیماری کا انتظار خوب رہا" لیلا درمیان ہی میں بول اٹھی۔ "آپکو شادی کرنا ہے تو جیسے اب ویسے پھر۔ فرض کیجیئے وہ تندرست ہوگئیں پھر کیا کیجیئے گا؟ ابھی شادی کرنے میں آپ فائدے میں رہینگے، لوگوں کی طرف سے ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنے کیلئے جواب طلبی پر آپ کہہ سکیں گے کہ میں نے اُسے پاگل سمجھکر دوسرا بیاہ کرلیا تھا۔ ورنہ اُسکے صحتیاب ہوجانے پر شادی کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہوجائیگی۔"

مسز گپتا نے لیلا کی تائید کی۔ "پرمودھ جی! لیلا ٹھیک کہتی ہے۔ اگر آپکی

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

شرمتی جی اچھی ہوگئیں تو اس حالت میں بیاہ کر کے آپ بڑی جھنجھٹ میں پھنس جائینگے۔"
پرمود میز پر کہنیاں ٹیک کر کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ بولا "تو پھر
ٹھیک رہیئے۔ رخصتوں سے پہلے ہی سب کام ہو جائے۔"

(۴)

لیکن پرمود کی امیدوں کے خلاف مالتی جلد ہی تندرست ہو گئی۔ پھر بھی پرمود
اُسے گھر نہ لا سکا۔ شیلا سے بیاہ جو کرنا تھا۔ مالتی نے بُلانے کے لئے کئی بار لکھا۔ اکیلے ہی
چلے آنے کی اجازت مانگی لیکن پرمود نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تو اُس سے دُور ہی رہنا چاہتا تھا۔
اُسے اپنے پاس آنے کی اجازت کیسے دیتا؟ اسی حالت میں دو مہینے گزر گئے۔ رخصتیں شروع ہوگئیں۔
پرمود اپنی نئی بیوی شیلا کے ساتھ "ہنی مون" منانے چل پڑا۔ پہلے شملہ جانے کا ارادہ ہوا لیکن مالتی
کے کسولی ہونے کے باعث اُس سمت جانا مناسب نہ تھا۔ چنانچہ پوربی کی طرف چلے۔ راستے میں لکھنؤ پڑا
سوچا۔ دو ایک دن یہاں کی بھی سیر کر لی جائے۔ اودھ کے نوابوں کے نشیمن عیش و عشرت پر پھر سے
بہار آ گئی۔ یہی دیکھنا تھا۔ چنانچہ لکھنؤ کی سیر کی گئی۔ چوک، امام باڑہ، پرانی مسجدیں، جدید سرکاری
عمارتیں ---- یہی سب کچھ۔

اسی رات کی گاڑی سے لکھنؤ کو الوداع کہنی تھی۔ پلیٹ فارم پر کافی ہجوم تھا۔ چھٹیوں
میں تقریباً سب کو سفر کی سوجھتی ہے۔ پرمود اور شیلا ایک ڈبے میں گھس گئے۔ قریب قریب سب
نشستیں پُر تھیں۔ ایک موٹا سا آدمی ایک سیٹ پر پاؤں پھیلائے سو رہا تھا۔ پرمود اُسے
جگانے کیلئے نیچے جھکا لیکن اُس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی چونک کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔
دوسری طرف دیکھا کھڑکی کے سامنے والی سیٹ پر ایک نوجوان عورت بیٹھی اُونگھ رہی تھی۔
پرمود کانپ اُٹھا۔ شیلا نے دیکھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور بے چینی کے آثار نمایاں ہیں۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اُس نے پوچھا "کیا بات ہے؟" "کچھ نہیں چلو اُترو۔ ہم دُوسری گاڑی پکڑینگے"۔ پرمودھ کی آواز حواس مجتمع کرنے پر بھی کانپ رہی تھی۔ خواہش ہونے پر بھی شیلا وجہ نہ پوچھ سکی۔ اُس نے کہا "قلی بلا لو۔" پرمودھ زور سے پکارا۔ "قلی"!

یہ آواز کان میں پڑتے ہی نوجوان عورت چونک اُٹھی۔ سامنے دیکھا، پرمودھ قلی کے سر پر سوٹ کیس رکھوا رہا ہے۔ اُس کے چہرے پر ایک حجاب آلود و حیا آمیز مسکراہٹ دوڑ گئی اور اُس نے موٹے آدمی کا کندھا پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بابو جی، بابو جی"!

پرمودھ نے یہ منظر دیکھا۔ گاڑی نے سیٹی دیدی۔ زیادہ سوچنے کا موقع نہ تھا۔ وہ ٹرین سے کود گیا۔ گاڑی چل چکی تھی، اُس کے پیر پلیٹ فارم کے چکنے فرش پر پڑے تو لیکن سنبھل نہ سکے۔ جھٹکے کے ساتھ وہ نیچے آ رہا۔ گاڑی تیزی سے اُس کے بدن پر سے گزر گئی۔

شیلا چلائی۔ "پرمودھ"! نوجوان عورت بھی چیخ اُٹھی۔ سیٹھ نے گھبرا کر زنجیر کھینچی گاڑی رُکی۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ پرمودھ کے بدن کے خون سے سُرخ ٹکڑے سیاہ پٹڑیوں پر بکھرے پڑے تھے۔ سیٹھ نے درد و غم کے مارے منہ پھیر لیا۔ شیلا درد بھری آواز سے رونے لگی۔ وُہ عورت بھی اُس کے ساتھ رو رہی تھی۔ مشترکہ غم سے اجنبیت کی ڈوری خود بخود ڈھیلی ہو گئی۔ اور وُہ دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

نوجوان عورت نے پوچھا۔ "تم ان کی کون تھیں؟"

"بیوی! ابھی شادی کو چند ہی دن ہوئے تھے" یہ کہتے ہوئے شیلا زور زور سے رو پڑی لیکن دوسری عورت اس کا ساتھ نہ دے سکی۔ اور وُہ حیران و ششدر اُس کے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔

شیلا نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔ "اور تم، تم اُن کی کون تھیں؟"

"ایشور جانیں" عورت نے کہا اور پلیٹ فارم کے فرش پر زور سے اپنا سر پٹک لیا۔

دلہن کا انتقام

"سیتا چیٹرجی"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

سیتا چیٹر جی۔ بی۔ اے

تعارف۔ آپ محترمہ سنتا چیٹر جی کی بہن ہیں۔ آپ نے بھی اپنی بہن کی طرح ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ اور اُس کے بعد کلکتہ یونیورسٹی سے بی' اے کی سند اعزاز کے ساتھ حاصل کی۔

آپ کو اپنی بہن کی طرح اصلاحی افسانے لکھنے سے دلچسپی ہے۔ آپ کا افسانہ "ناکام" ہندوستان کے چند گنتی کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتا ہے بنگالی کے علاوہ آپ کو انگریزی زبان پر بھی غیر معمولی عبور حاصل ہے۔

آپ نے اپنی بہن محترمہ سنتا چیٹر جی کے بعض افسانے بنگالی زبان سے انگریزی میں منتقل کئے ہیں۔ جو "ماڈرن ریویو" میں چھپ چکے ہیں۔

آپ کو مصوری، موسیقی اور سنگتراشی سے بے حد دلچسپی ہے۔ آپ کے افسانے " دلہن کا انتقام" کا ترجمہ عزیز بہن محترمہ کنیز فاطمہ صاحبہ حیا لکھنوی نے کیا ہے ؎

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

سرآما ایک غریب آدمی کی لڑکی تھی۔ آج سے کئی سال پہلے وہ جوان ہو چکی تھی۔ لیکن اس کی عمر ابھی چودہ سال ہی بتائی جاتی تھی۔ خدا کا قانون تو یہی ہے۔ کہ جتنی مدت تک کوئی جیئے۔ اُسکی عمر بڑھتی جاتی ہے۔ مگر قدیم ہند و سوسائٹی کا قانون یہی تھا کہ جب تک کوئی لڑکی کنواری رہے اسکی عمر چودہ سے متجاوز نہیں ہونی چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ سرآما کی عمر بھی چودہ سال ہی بتائی جاتی تھی۔ حالانکہ اُس کے اَور سب رشتہ دار جانتے تھے کہ اُس کی عمر چودہ سال نہیں، پندرہ بیس سال ہے۔ اَور اکثر اشارۃً یا کنایتہً باتوں ہی باتوں میں وُہ سرآما کی ماں پر کوئی چوٹ بھی کر جاتے۔

سرآما کے والدین حقیقت میں بہت غریب تھے۔ انہیں پیٹ بھر کر کھانا بھی میسر نہیں ہوتا تھا۔ پھر وُہ اپنے بچوں کو تعلیم کس طرح دلاتے۔ چنانچہ سرآما بھی زیورِ علم سے محروم تھی۔ البتہ قدرت نے اُسے حُسن اَور جوانی کی دولت

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

سے مالا مال کر رکھا تھا۔

نو دس سال کی عمر تک تو سرآما اپنے ہم عمر بچوں سے کھیلنے گلیوں میں نکل جاتی اور معمولی سودا سلف بھی ماں کو لادیتی۔ مگر اب عرصے سے اُس سے یہ آزادی چھین چکی تھی اور اب تو وہ اِس لیئے بھی گھر سے باہر نہ نکلتی کہ نوجوان گھور گھور کر اُس کی طرف دیکھنے لگتے تھے۔ اگرچہ اس کے پاس اچھی پوشاک نہ تھی۔ لیکن حُسن کو پوشاک کی ضرورت کیا ہے۔ وہ گدڑی کا لعل تھی، وہ بادلوں میں گھرا ہوا چاند تھی۔ البتہ اُس کے پاس ایک ریشمی ساڑھی ضرور تھی جو وہ شادی بیاہ یا کسی دوسری تقریب پر پہن لیا کرتی تھی۔ لیکن یہ ساڑھی خود اُس کے لئے نہیں خریدی گئی تھی بلکہ اُسکی ماں کی تھی جو اس نے لباسِ عروسی کے طور پر استعمال کی تھی۔

لیکن سرآما کی قسمت میں لکھا تھا کہ اس غربت کے عالم میں بھی قدرت اُسکی تعلیم و تربیت کا انتظام کردیگی۔ چنانچہ قدرت نے اِس مقصد کو پورا کرنے کا کام ششو دھر نامی ایک نوجوان لڑکے کے سپرد کیا۔ ششو دھر اس محلہ میں رہتا تھا جسمیں سرآما رہتی تھی۔ اور اُس کے بھائی کا نہایت گہرا دوست تھا۔ ششو دھر اور سرآما کے اسکول میں طلباء نے ایک انجمن بنائی جس میں گرما گرم بحثیں ہوا کرتیں اور کبھی کبھی بعض نہایت اہم تجاویز پاس ہوا کرتیں۔ مگر ان پر عمل شاذ و نادر ہی ہوتا۔ چنانچہ اسی انجمن کے جلسے میں ایک مرتبہ یہ فیصلہ ہوا۔ کہ انجمن کا ہر رکن کم از کم ایک اَن پڑھ شخص کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ ممکن ہے کہ ان مبارک کوششوں سے ملک سے جہالت دُور ہو جائے۔

انجمن کے ایک رکن ششو دھر نے مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ اِس تجویز پر ضرور

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

عمل کریگا۔ چنانچہ ایک دن صبح ہی سے وُہ سرِاما کے گھر پہنچا۔ اُس وقت وُہ کدو چھیل رہی تھی۔ اور اس کی ماں کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ اُس نے وہاں جاتے ہی سراما کی ماں سے کہا کہ خالہ ہمارے اسکول کی انجمن نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ ہر شخص ایک نہ ایک ناخواندہ آدمی کو تعلیم دے۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آج شام سے سراما کو پڑھانا شروع کر دوں "

سراما کی ماں خوش ہو کر بولی "میرے بچے اگر تم اپنی بہن کو پڑھنا لکھنا سکھا دو تو تمام عمر تمہاری ممنونِ احسان رہوں گی۔ ذرا دیکھو تو سراما کتنی بڑی ہو گئی ہے لیکن اُسے ایک لفظ تک پڑھنا نہیں آیا۔ پرماتما جانے یہ لڑکی کیسے زندگی بسر کریگی۔ آج کل تو اس دُنیا میں اَن پڑھوں کا گزارہ بہت مشکل ہے تھوڑا سا وقت روز اُسے پڑھانے میں لگا دیا کرو۔ میری دِلی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں" ششودھر ایک اچھا شاگرد پا کر بہت خوش ہوا اور واپس چلا گیا۔

اسی دن شام کو ششودھر نے سراما کو سبق پڑھانا شروع کر دیا۔ گلی میں نصب کردہ لیمپ کی روشنی ان کے لئے کافی تھی ششودھر اپنے ہاں سے ایک پرانی کتاب ایک دوات، ایک قلم اور ایک کاپی لے آیا۔ اور یہ سامان ان کے لئے کافی تھا۔ سراما بڑی ہوشیار اور ذہین لڑکی تھی۔ اُسے فوراً اپنا سبق یاد ہو جاتا۔ بہت تھوڑی مدت میں اُس نے پہلی کتاب ختم کر لی۔ شاگرد کی غیر معمولی کامیابی دیکھ کر استاد خوش ہو ہو جاتا۔

چھ ماہ کے عرصے میں سراما خط لکھنا سیکھ گئی۔ اور آسان آسان کتابیں

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

فر فر پڑھ لیتی لیکن استاد نے ابھی شاگرد کا سلسلہ تعلیم ختم نہ کیا۔ اُس نے اُسے انگریزی پڑھانی شروع کر دی۔ ساتھ ساتھ وُہ اُسے اچھے اچھے رسائل اور کہانیوں کی کتابیں بھی لا دیتا۔ جنہیں وُہ بڑے شغف اور انہماک سے پڑھا کرتی۔ اب استاد شاگرد کو زیادہ محنت سے پڑھانے لگا۔ اب اُس کی فرصت کا بیشتر حصہ شاگرد ہی کے مکان پر بسر ہوتا۔ شاگرد کو بھی اپنے استاد سے اس قدر دلچسپی پیدا ہو گئی کہ جس دن استاد نہ آتا شاگرد کی طبیعت بے چین اور اداس رہتی۔

سراما کے والدین استاد اور شاگرد کے اِن مخلصانہ اور گہرے تعلقات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر وُہ ان کے باہمی تعلقات کو منقطع کرنے کی جُرأت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اسکی وجہ ایک تو یہ تھی کہ ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی۔ کہ ان دونوں کے تعلقات کو اب کس طرح ختم کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ ششو دھر نئے نئے طریقوں سے ان کی مدد کرتا۔ وُہ میڈیکل کالج کلکتہ میں پڑھتا تھا۔ جب ضرورت پڑتی تو انہیں طبّی امداد بھی بہم پہنچاتا۔ دوائیں انہیں مفت لا دیتا۔ اور اگر سراما کے ماں باپ کو تھوڑی سی رقم ادھار لینے کی ضرورت پڑتی تو حتی الامکان وُہ انہیں قرض دینے سے بھی گریز نہ کرتا۔ بلکہ اکثر قرضے کی رقوم تک واپس نہ لیتا۔ اگر سراما کے ماں باپ اس سے تعلقات منقطع کر لیتے تو پھر انہیں ایسا مخلص اور مہربان دوست جو ہر مصیبت میں ان کے کام آتا کہاں سے مِلتا۔

سراما کی ماں اکثر اپنے شوہر سے کہا کرتی کہ ایسا اچھا لڑکا میں نے کبھی

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

نہیں دیکھا۔ اُسے سراما سے اُنس بھی ہے اور وہ اسکی تربیت بھی اپنے منشاء
کے مطابق کر رہا ہے۔ اگر ان دونوں کی شادی ہو جائے تو کیسی اچھی بات ہو؟"
خاوند اپنی بیوی کی دلچسپ خیال آرائیوں پر ہنس دیتا۔ اور کہتا۔ "تم تو
پگلی ہو۔ ایسی باتیں کرتی ہو جو کبھی سُننے میں نہیں آئیں۔ ہم مفلس و قلاش اور
بھکاری ہیں۔ اپنی لڑکی کو جہیز میں کچھ نہیں دے سکتے۔ اس صورت میں کیا تم
ایک لمحے کیلئے بھی یہ تصور کر سکتی ہو کہ وہ ہماری لڑکی سے شادی کرنا چاہے گا۔ وہ
کبھی ہم بھکاریوں کی لڑکی سے شادی کرنے پر رضامند نہیں ہو سکتا۔"
اس پر اُسکی بیوی کہتی۔ "لیکن اگر اُسے اُسی سے محبت ہو تو؟"
سراما کا باپ جواب دیتا۔ "اُس کی پسند کو کون پوچھتا ہے۔ جب شادی
کا وقت آئیگا۔ تو اُس کے والدین اُس کی پسند کو تھوڑے پوچھیں گے۔ اسے
تو اُسی لڑکی سے شادی کرنی پڑے گی جسے اسکے والدین منتخب کریں۔ شِشودھر
کا باپ بڑا عیّار اور معاملہ فہم ہے وُہ تو ابھی سے سوچ رہا ہے کہ وہ اپنے لڑکے
کو کسی ایسی لڑکی سے وابستہ کرے جس کے والدین اُسے بہت سا روپیہ دے سکیں
زیادہ دن نہیں گزرے کہ وُہ کہہ رہا تھا۔ میں شِشودھر کو تکمیلِ تعلیم کیلئے ولایت
بھیج رہا ہوں تاکہ واپسی پر اسکی شادی کسی امیر اور اچھے گھرانے میں ہو سکے۔
جہاں سے اسے بہت سا روپیہ آئے۔ جس شخص نے ایسے ایسے منصوبے باندھ
رکھے ہیں بھلا ہم جیسے فاقہ کشوں کو وُہ کب خاطر میں لا سکتا ہے؟"
لیکن بیوی شوہر کی یاس انگیز باتوں سے متاثر نہ ہوتی۔ وہ اب
تک پُر اُمید تھی۔ ایک دن وُہ اپنے شوہر سے کہنے لگی۔ "کیا میں اشارۃً کنایۃً

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اس بارے میں ششودھر کا عندیہ معلوم کروں۔ لڑکی کی عمر بیس سال سے اوپر ہونیوالی ہے۔ اس کی شادی جلد از جلد ہو جانی چاہیئے۔ مجھے تو انہی فکروں میں نیند نہیں آتی۔ لڑکی جوان ہو گئی ہے۔ اور مجھے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر شرم محسوس ہوتی ہے میں تو اس عمر میں چار بچوں کی ماں تھی۔"

بیوی کی بات سن کر شوہر کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور وہ کہنے لگا "مجھے معلوم ہے کہ ان باتوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ تمھارے دلکش خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہونگے۔ ہوائی قلعے تعمیر نہ کرو۔ اور اگر اس کے باپ کو تمھاری ساز باز کا علم ہوگیا۔ تو وہ آفت برپا کر دیگا۔ میں سرا ما کی طرف سے غافل نہیں ہوں اور جلد سے جلد اس کی شادی کر دینا چاہتا ہوں۔ سب سے بڑی مشکل تو یہی ہے کہ جب لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ ہم لڑکی کو جہیز میں کیسا دیں گے۔ تو وہ کانوں پر ہاتھ دھرنے لگتے ہیں۔ اس زمانے میں اگر لڑکی شکل و صورت کے اعتبار سے بری بھی ہو تو کوئی پروا نہیں کرتا۔ آج کل تو ہر جگہ روپے کی قدر ہے روپے کی۔ مگر یہاں تو رونا اس بات کا ہے کہ لڑکی کچھ زیادہ حسین بھی نہیں ہے۔"

بیوی کہنے لگی۔ میری بیٹی حسین کیوں ہوتی۔ اگر اسے کھانے پہننے کو اچھا ملتا۔ دوسرا ایک بنگالی لڑکی میموں اور پارسنوں کی طرح سفید فارم تھوڑی ہو سکتی ہے۔

ششودھر کا باپ اپنے بیٹے کو انگلستان بھیجنے کی تیاریاں تو کر رہا تھا۔ مگر اس کے پاس روپیہ نہیں تھا۔ اور اس مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے کافی

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

روپے کی ضرورت تھی۔ ششو دھر کا بوڑھا باپ چاہتا تھا۔ کہ اگر روپے کا انتظام نہ ہو سکے۔ تو ششو دھر کی شادی امیر کبیر گھرانے میں کر دے۔ تاکہ لڑکی کے والدین آسانی سے اُسے انگلستان بھیج دیں۔ لیکن ششو دھر نے باپ کی تجویز ماننے سے انکار کر دیا۔ وُہ کہتا تھا کہ مجھے تعلیم حاصل کرنے کے بعد شادی کرنی چاہیئے۔ تاکہ میں کمانے کے قابل ہو سکوں۔ اور اگر روپیہ کا انتظام نہ ہو سکے۔ تو ولایت جانے کا خیال ہی ترک کر دیا جائے۔

باپ کو بیٹے کی یہ باتیں پسند نہ آتی تھیں لیکن وُہ اسے اپنی بات منوانے پر زیادہ مجبور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بیچارہ یہ کہہ کر دل ٹھنڈا کر لیتا کہ آج کل کے تعلیمیافتہ لڑکوں سے خدا بچائے۔ جو اپنی شادی بیاہ کے مسئلوں میں بھی دخل اندازی کرنے لگتے ہیں۔

بہر حال باپ کو اپنے ہونہار بیٹے کے لئے ایک امیر کبیر آدمی کی لڑکی مل ہی گئی۔ طرفین سے خوب خفیہ مشورے ہوئے۔ لڑکی کا باپ کہتا تھا کہ "میں اپنی بیٹی کی شادی جلد از جلد کر دینا چاہتا ہوں۔ لڑکے کو میں انگلستان بھی بھیج دوں گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے وُہ میری لڑکی سے شادی کرلے۔ اِن لمبی لمبی تجویزوں کا میں قائل نہیں ہوں۔ ششو دھر نوجوان اور حسین ہے بہت ممکن ہے کہ اسکی طبیعت کسی میم پر آجائے۔ تو بتاؤ میرا کیا حشر ہوگا۔ روپیہ بھی برباد ہوگا۔ اور عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔"

ششو دھر کا باپ کہتا تھا کہ "بھائی چند سال صبر کرلو۔ میرا بیٹا ایسا نہیں ہے کہ کسی میم کو بیاہ لائے۔ میں اسی رشتے کو پسند کرتا ہوں۔ کوئی

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

دوسری لڑکی مجھے ایک آنکھ نہ بھائے گی۔ میرا لڑکا بھی بڑا ہونہار اور شریف ہے۔ میاں بیوی کی بہت اچھی طرح نبھ جائیگی۔"

بڑی ردّ وکد کے بعد لڑکی کا باپ رضامند ہو گیا۔ لڑکی کی عمر بھی ابھی کم تھی۔ اسلئے وُہ چند سال صبر کر سکتا تھا۔ اور چونکہ وُہ تھا بھی خوشحال اور دولتمند۔ اسلئے سماج کی لعنت ملامت سے بچنا اُس کے لئے کوئی دشوار امر نہیں تھا۔

فیصلہ یہ ہوا کہ ششو دھر کو ولایت بھیج دیا جائے اور ولائت کے اخراجات مکان رہن رکھکر مہیا کئے جائیں۔ چنانچہ ششو دھر کے باپ نے اپنا چھوٹا سا مکان گروی رکھ دیا۔ ماں نے کچھ زیور بیچ ڈالے۔ اور ان کے بیٹے کی تعلیم کے لئے کافی روپیہ جمع ہو گیا۔

ششو دھر نے جب اپنی ماں کے مغموم چہرے پر نگاہ ڈالی تو کہنے لگا۔ "ماتاجی گھبرایئے نہیں۔ اگر مَیں دو سال بعد زندہ سلامت واپس آ گیا۔ تو آپ کو ان زیورات سے دُگنے زیورات اور اِس مکان سے دوگنا مکان بنوا دونگا۔"

ماں خشک ہنسی ہنس کر بولی "میرے لال! میں سب کچھ جانتی ہوں"۔

سرآما کی ماں اب بڑی کشمکش و پیچ میں تھی۔ وُہ سوچنے لگی کہ اگر میں نے شادی کی بات خود چھیڑی تو معاملہ بہت دُور تک پہنچ جائے گا۔ بہرحال میں ششو دھر کو عزت کا واسطہ دیکر کہونگی۔ کہ وہ شادی کا اقرار کر لے۔ قدامت پرستوں کی نظر میں سرآما کی عمر پہلے ہی کافی ہو چکی ہے۔ اب اگر ایک دو سال اور بڑی ہو جائیگی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن ہمیں کوتاہ اندیشی اور جلدبازی

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

سے ایسے دُولہا کو کھو نہیں دینا چاہیئے۔"

آخر اُس نے ایک دِن شنشو دھر کو اپنے گھر پر کھانا کھانے کی دعوت دی دعوت کے لیئے اس نے اپنے ہمسایوں سے کچھ قرض لے لیا۔ اور عمدہ عمدہ کھانے تیار کرنے لگی۔ اُس نے اور سرا مانے مِل کر شام سے پہلے پہلے ہی کھانا تیار کر لیا۔ تاکہ وُہ اطمینان کے ساتھ شنشو دھر سے بات چیت کر سکے۔

کھانا پکا کر سرا ما کی ماں نے اپنی بیٹی سے کہا۔" جاؤ بیٹی نہا دھو کر اپنے بالوں میں کنگھی کر لو اور صاف کپڑے پہن لو۔"

لیکن بچاری سرا ما کے پاس اچھے کپڑے یا زیورات کہاں تھے۔ ماں کے الفاظ سُنکر اُس کے دِل پر ایک چوٹ سی لگی۔ آہ! وُہ کِس قدر بد نصیب تھی۔ پہننے اوڑھنے کی یہی عمر ہوتی ہے لیکن سرا ما کی قسمت میں یہی لکھا تھا۔ کہ وُہ تمام عمر چیتھڑے پہنتی رہے۔

شنشو دھر شام کو وقت پر اُن کے گھر آ پہنچا۔ سرا ما سامنے کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اُس کی ماں باورچی خانے میں تھی۔ شنشو دھر نے گھر میں قدم رکھتے ہی پوچھا۔" سرا ما تم اندھیرے میں تنہا کیوں بیٹھی ہو؟"

سرا ما اُسے دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور بولی۔" بیٹھ جایئے۔ میں دوسرے کمرے میں جا کر لیمپ روشن کرتی ہوں۔"

کہنے کو تو اُس نے فقرہ کہہ دیا۔ مگر اُس کی آواز بھرا گئی اور اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

شنشو دھر بولا۔" ارے اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے۔ کھڑکی کھول

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

دو۔ گلی کے لیمپ کی روشنی ہمیں بہت کافی ہوگی۔"

سر اما نے کھڑکی کھول دی اور ششو دھر ایک ٹوٹی ہوئی کرسی گھسیٹ کر اُس پر بیٹھ گیا۔

پھر وہ سر اما کو مخاطب کر کے بولا "میں چند سال کے لئے وطن سے باہر جا رہا ہوں۔ غالباً دو سال تک مجھے ولایت رہنا ہوگا۔ تم اپنی تعلیم کی طرف سے غافل نہ ہو جانا۔ میں ہر ڈاک میں تمھاری طرف خط بھیجا کرونگا۔ کاش میں تمھیں بھی اپنے ساتھ لے جا سکتا۔ لیکن میں بےبس و مجبور ہوں۔ خیر دوسری مرتبہ سہی۔ جن کتابوں کی تمھیں ضرورت ہو۔ بلا پس و پیش لائبریری سے لے لیا کرنا۔ میں لائبریرین سے کہہ جاؤنگا۔ کہ وہ تمھیں ہر کتاب جس کی ضرورت ہو مہیا کر دے۔"

سر اما خاموش بیٹھی رہی۔ ششو دھر نے اپنی کرسی اُس کے قریب لی اور اُس پر جھک کر بولا۔ "ایں سر اما تمھیں کیا ہوا ہے؟ تم تو رو رہی ہو"

ششو دھر کے منہ سے یہ الفاظ سنکر وہ اور زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور اِتنا روئی کہ رو رو کر بےحال ہوگئی۔ ششو دھر کو کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ اُسے کس طرح خاموش کرائے۔ دونوں ایک دوسرے کے دلی راز کو سمجھتے تھے۔ لیکن دونوں بےبس و مجبور تھے۔ جب سر اما رو رو کر ہلکان ہوگئی۔ تو اُسے چپ کرانے کا ایک طریقہ ششو دھر کی سمجھ میں آگیا۔ کہنے لگا۔ "سر اما! اب جبکہ میں تم سے رخصت ہونے آیا ہوں تم رو رو کر مجھے پریشان اور بےحال نہ کرو تم جانتی ہو کہ اس وقت میں بالکل مجبور ہوں۔ مجھے کوئی آزادی حاصل نہیں ورنہ میں ابھی یہ تمام معاملہ سلجھا دیتا۔ خدا کے لئے تم دو سال صبر کرو۔ اس

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کے بعد وہی ہوگا۔ جو تم کہو گی۔"

سرآما نے اپنے آنسو پونچھ لیئے اور ایسا معلوم ہوا جیسے ششو دھر کی باتوں نے اُسے بالکل مطمئن کر دیا ہے۔ عین اُس وقت سرآما کی ماں نے اسنے آواز دے کر بلا لیا۔ اور اسے اُٹھ کر وہاں سے جانا پڑا۔

ششو دھر نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ اور سرآما کی ماں کہنے لگی۔"یہ سب چیزیں سرآما ہی نے تیار کی ہیں۔" اس کے بعد بوڑھی عورت نے سرآما کو وہاں سے اُٹھ کر چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اور وہ وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔

اب سرآما کی ماں نے اصل بات چھیڑی اور کہنے لگی۔"میرے پیارے بچے۔ تم نے سرآما کو اپنی مرضی کے مطابق لکھایا پڑھایا ہے اور ہر طرح سے اس کی تربیت کی ہے۔ کیا اب تم اُسے چھوڑ دو گے؟ اگرچہ یہ بات ہمیں اپنے منہ سے نکالنی نہیں چاہیئے تھی مگر سچ پوچھو تو ہماری تمام تر امیدوں کا انحصار تمہاری ہی ذات پر ہے۔"

ششو دھر سرآما کی ماں کے منہ سے یہ غیر متوقع بات سن کر حیران سا ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔ کہ "اس وقت میں اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کر سکتا۔ میں قرض لے کر حصول تعلیم کے لئے ولایت جا رہا ہوں۔ واپس آکر حتی المقدور ہر شخص کا حق ادا کرنے کی کوشش کروں گا۔"

سرآما کی ماں کے لئے یہی بات کافی تھی۔ وہ مطمئن ہو گئی۔ اور ایک ہفتہ کے بعد ششو دھر ولایت روانہ ہو گیا۔

وقت گزرتا گیا۔ دن بھر سرآما کام دھندے میں لگی رہتی۔ شام کے وقت

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

جب اُسے فرصت ملتی تو وہ مکان کا دریچہ کھول کر بیٹھ جاتی۔ اور گلی کے لمپ کی روشنی میں مصروفِ مطالعہ ہو جاتی۔ وُہ اپنے استاد کی موجودگی میں تعلیم اور مطالعہ سے اتنی دلچسپی نہیں لیتی تھی جتنی اب لینے لگی۔ وُہ اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ مطالعہ میں گزارنے لگی۔ اس کی ماں کہا کرتی۔ کہ بیٹی تم نے تو نہ جانے کتابوں کے کتنے چھکڑے پڑھ ڈالے۔ اگر تو لڑکی کی بجائے لڑکا ہوتی۔ تو یہ مطالعہ تیرے کسی کام بھی آتا۔ خیر آج کل پڑھی لکھی لڑکیوں کی بڑی قدر ہوتی ہے۔ دیکھیں ہمارا کیا حشر ہوتا ہے۔"

ولایت سے اکثر شنشودھر کے خطوط آیا جایا کرتے تھے لیکن سرامان کا جواب نہ لکھتی تھی کیونکہ وُہ کنواری تھی اور اس پر طرّہ یہ کہ وُہ غریب اور مفلس تھی اگر وُہ خط لکھتی تو بدنام ہو جاتی۔ اسلئے سراما کی بجائے اُس کی ماں خطوط کا جواب دیا کرتی۔

ایک دن سراما کا باپ معمول سے بہت پہلے دفتر سے آگیا۔ اس نے اپنی بیوی کے ہاتھ میں دو روپے دیئے اور کہا۔ کہ کچھ مٹھائی وغیرہ اور کھانے پینے کا سامان منگوا لو۔ اور سراما سے کہہ دو۔ کہ لباس تبدیل کر لے۔ کچھ لوگ اسے دیکھنے آنے والے ہیں۔

یہ سُنتے ہی سراما کی ماں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وُہ گھبرا کر کہنے لگی۔ "آخر ان باتوں سے کیا فائدہ ؟ کیا شنشودھر نے نہیں کہا تھا کہ ہماری لڑکی کے متعلق اُس پر جو فرض عائد ہوتا ہے۔ وہ اُسے پورا کرے گا۔ جب وُہ یہ قول دے چکا ہے۔ تو ہم اپنے قول سے کیوں پھریں۔ اگر وہ ہماری

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

یہ باتیں سُن لے تو کیا کہے"۔

سرلاما کا باپ آگ بگولا ہو کر کہنے لگا۔ "اُس چھوکرے کے لفظوں کی کوئی قیمت نہیں۔ اُسے کون پوچھتا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس کے باپ نے اُس کی شادی کے متعلق تمام مسائل کیشب سے طے کر لئے ہیں اور ولایت سے آتے ہی اُس کی شادی کیشب کی لڑکی سے ہو جائیگی"۔

یہ غیر متوقع خبر سُن کر سرلاما کی ماں سکتہ زدہ ہو گئی اور اُس کے منہ سے صرف یہ الفاظ نکلے۔ "کتنا بُرا ہے یہ شخص، اُس نے میرا کلیجہ ہی کاٹ ڈالا ہے"۔

یہ کہکر وُہ سرلاما کو تلاش کرنے چلی گئی۔ سرلاما اب انتہائی آہ وزاری کے ساتھ ماں کی منتیں کرنے لگی۔ کہ "ماں ماں مجھے بھاڑ میں نہ جھونکو۔ میں غیروں کے سامنے نہیں کھڑی ہو سکتی۔ میں فرطِ شرم سے زمین میں گڑ جاؤں گی۔ میں برداشت نہیں کر سکونگی کہ وُہ لوگ مجھے گھور گھور کر دیکھیں"۔

بیٹی کی باتیں سُن کر ماں اُسے کوسنے لگی اور شمشو دھر کی برائیاں بیان کرنے لگی۔ کہ وُہ بڑا جھوٹا اور فتنہ پرواز لڑکا تھا۔ اس کی باتوں پر تمہیں اعتبار نہ کرنا چاہیئے۔ وُہ ہرگز تم سے شادی نہیں کریگا"۔

جب بیٹی کسی طرح ماں کی باتوں میں نہ آئی۔ تو ماں بیٹی کو تقریباً گھسیٹتی ہوئی مکان کے اندرونی حصّہ سے باہر لے آئی اور اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی ساتھ ساتھ وہ شمشو دھر کو بھی بُرا بھلا کہتی جاتی تھی۔ اب ماں نے اسے ساڑھی پہنانی چاہی لیکن اُس نے صاف انکار کر دیا۔ ماں کی گالیاں چٹکیاں اور گھونسے

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اُس پر اثر انداز نہ ہوئے۔ وُہ اپنی ہی ضد پر اَڑی رہی۔

شام کو دو معمر آدمی اُن کے گھر آئے۔ سرامّا کو ان کے سامنے لایا گیا۔ انہوں نے چند سوالات کئے۔ جن کا جواب سرامّا کی طرف سے اُس کا باپ دیتا رہا۔ سرامّا تو یوں نظر آ رہی تھی جیسے اس کے منہ میں زبان ہی نہیں۔

ایک بُڈھا بولا۔ "یہ چھوکری تو سولہ سال سے کچھ اُوپر معلوم ہوتی ہے۔"

دوسرا بڈھا بولا۔ "ہاں میرا بھی یہی خیال ہے کوئی بڑی بات نہیں کہ اسکی عمر اٹھارہ انیس سال ہو۔"

کچھ کھا پی کر دونوں رخصت ہو گئے۔

دوسرے دن اطلاع آئی کہ وُہ سرامّا کو بیاہ لیجانے پر رضامند ہیں۔

سرامّا کی ماں نے دولہا کے بارے میں اپنے شوہر سے چند باتیں کرید کرید کر پوچھنا چاہیں لیکن اُس کا شوہر ٹس سے مس نہ ہوا۔ بلکہ اپنی بیوی کو باتوں میں ٹالتا رہا۔

چند روز بعد سرامّا کا باپ، ہونے والے دُولہا کے گھر اُسے دیکھنے گیا۔ واپس آیا تو اسکی بیوی نے اس سے پہلا سوال یہ کیا کہ "کیا دولہا بہت بوڑھا ہے؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "نہیں اُس کی عمر کوئی تیس بتیس سال ہوگی۔"

بیوی کہنے لگی۔ "کیا وُہ رنڈوا ہے؟ تم تو کہتے تھے۔ کہ وُہ بڑے امیر کبیر لوگ ہیں۔ لیکن وُہ ہماری لڑکی کو بغیر جہیز کے کیوں قبول کر رہے ہیں؟ مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔"

خاوند بولا۔ "تم ایسی باتیں کیوں کرتی ہو۔ اگر دولہا میں کوئی عیب نہ

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ہوتا تو یہ لوگ ہماری لڑکی سے شادی کرنے پر کیوں تیار ہوتے۔ ہم نہ تو اپنی لڑکی کو کوئی جہیز دے رہے ہیں اور نہ یہ بیچاری کوئی اتنی خوبصورت ہے۔"

بیوی جھلّا کر کہنے لگی۔" لیکن تم ساری بات صاف صاف کیوں نہیں مجھ سے کہہ دیتے۔ آخر وہ میری بھی تو بیٹی ہے۔ میں تو مارے خوف کے مری جا رہی ہوں۔"

خاوند بغیر جواب دیئے اُٹھ کر گھر سے چلا گیا۔ واپس آ کر کہنے لگا۔" تم سراما کو ششو دھر کے گھر جانے سے روک دو۔ اب تمہیں ہر معاملے میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیئے۔ ورنہ نسبت ٹوٹ جائے گی اور ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ دُنیا تو رائی کا پربت بنا لیتی ہے اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی۔ تو ناک کٹ جائے گی۔"

بیوی کہنے لگی۔" ششو دھر کی ماں کو سراما سے بہت محبت ہے۔ وہ اکثر بیچاری بیمار رہتی ہے۔ اس کا علاج و لاج بھی نہیں ہو رہا۔ بیچاروں نے اپنے لڑکے کو باہر بھیجنے کے لئے بے انداز رقم بطورِ قرض لے لی ہے۔ نہ جانے بیچاروں کا کیا حشر ہو گا۔"

اِس پر خاوند بغیر کچھ کہے اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

سراما کی شادی کا دن آن پہنچا۔ دلھن کا باپ غریب تھا۔ اِسلئے شادی کا جشن بڑی دھوم دھام سے نہ منایا گیا۔ اڑوس پڑوس کے سب مرد عورتیں اکٹھی ہو گئیں۔ ان میں سے بعض کو تو مدعو کیا گیا تھا اور بعض لوگ بغیر مدعو کئے بھی آ دھمکے تھے۔ اِس وقت سراما کی حالت قابلِ رحم تھی وہ

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

پتھر کی بے جان مورتی بنی ہوئی تھی۔ نہ وہ روتی تھی نہ بولتی تھی۔ اسکی سہیلیوں نے اُسے گُدگُدا کر ہنسانا چاہا۔ مگر ان کی سب کوششیں بے کار ثابت ہوئیں بڑی مشکل سے انہوں نے سرامّا کو لباسِ عروسی پہنایا۔ تھوڑی دیر میں دولہا بھی آ پہنچا۔ عورتوں نے گرم جوشی سے اُس کا خیر مقدم کیا۔ سرامّا کی ماں بار بار گھبرا کر اُس کی طرف دیکھتی تھی لیکن اُس کے چہرے پر کوئی غیر معمولی کیفیت نظر نہ آتی تھی۔ وہ ایک سیدھا سادا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ البتہ اُس کے لبوں پر مہرِ سکوت لگی تھی۔ وہ کچھ کچھ کھویا کھویا سا معلوم ہوتا تھا۔ نہ وہ بڈھا تھا نہ جوان۔ دوسری لڑکیوں نے اُس کا مضحکہ اڑانا شروع کیا۔ "واہ واہ کیسا اچھا جوڑا ہے۔ دولہا دلہن دونوں گونگے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو۔ آج کل تو فیشن بھی یہی ہے"۔

شادی ہوگئی۔ دولہا دلہن کو حجلۂ عروسی میں پہنچا دیا گیا۔ سب نوجوان عورتیں اور لڑکیاں اس کمرے میں آ جمع ہوئیں۔

ایک لڑکی کہنے لگی۔ "ارے دیکھنا۔ سرامّا آج کتنی حسین معلوم ہو رہی ہے۔ کیوں نہ ہو۔ لباس ہی سے تو انسان انسان بنتا ہے"۔

دوسری آہستہ سے بولی۔ "ٹھیک کہتی ہو بہن! سرامّا بڑی خوش قسمت لڑکی ہے۔ اُس کے ماں باپ نے اسکی شادی پر ایک کوڑی بھی خرچ نہیں کی۔ لیکن سرامّا کو اس کے سسرال والوں نے زیورات میں غرق کر رکھا ہے۔ یہ سب چیزیں لڑکے والوں ہی کی تو ہیں"۔

پہلی لڑکی کہنے لگی۔ "ایسے اتفاقات بہت کم ہوتے ہیں"۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

لڑکیوں نے دولہا کو ہنسانے اور بنانے کی پوری پوری کوشش کرنی شروع کی۔
ایک نوجوان عورت کہنے لگی۔ "سرلا تمہارا دولہا کیا بہرا ہے؟"
دولہا صاحب مسکرا کر بولے۔ "میں بہرا نہیں ہوں۔ میرا نام بنارس ہے۔"
اِس پر تمام عورتیں حیرت زدہ ہو کر اُس کا منہ تکنے لگیں۔ ایک کہنے لگی
"تم بنارس سے آئے ہو؟"
دوسری کہنے لگی۔ "تمہارا نام بنارس ہے یا بنارس چند؟"
غرض اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ اور طرح طرح کے فقرے چست ہوتے رہے۔ دولہا نے اب پھر چُپ سادھ لی تھی۔ کچھ دیر ہنسی مذاق کرنے کے بعد کچھ عورتیں وہاں سے چلی گئیں۔ اور باقی مکان کے گوشوں میں اِدھر اُدھر اُونگھنے لگیں۔

آدھی رات تھی۔ گھر میں ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ ہر شخص مصروفِ خواب تھا۔ یکایک ایک خوفناک چیخ نے سکوت توڑا۔ اور گھبرا کر سب لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جو عورتیں حجلۂ عروسی کے قریب سوئی ہوئی تھیں۔ وہ اُٹھ کر فرطِ دہشت سے اِدھر اُدھر بھاگ گئیں۔ سرلا کے ماں باپ دوڑے دوڑے حجلۂ عروسی میں داخل ہوئے۔ لیمپ فوراً روشن کیا گیا۔ دولہا کمرے کے وسط میں فوجی افسروں کی طرح ٹانگیں کشادہ کیے۔ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر اپنے دونوں بازو اوپر کی طرف بلند کیے تن کر کھڑا ہوا تھا۔ وہ ایک نفرت انگیز ہنسی ہنس رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا۔ کہ "میں مہاراجہ بنارس ہوں میں دُنیا کو فتح کروں گا۔ ہر ایک شخص کو مجھے سلام کرنا چاہیئے۔"

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

دُولھا کے گھر والوں کے دو ملازم گھر سے باہر سو رہے تھے۔ اس شور اور افراتفری نے انہیں بھی جگا دیا۔ وُہ بھی دَوڑے دَوڑے اندر آ گئے۔ آتے ہی انہوں نے اپنے دیوانے دولھا میاں کو تھام لیا۔ اور اُسے خاموش کرانے لگے۔ لیکن وہ کمبخت تو کسی کے قابو میں ہی نہیں آتا تھا۔ وُہ بڑے بڑے ڈگ بھر کر آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ اور ملازموں سے طاقت آزمائی کر رہا تھا اُس کے ملازموں نے بہت کوشش کی۔ کہ خوفزدہ عورتوں کو تسلی دے کر خاموش کرا دیں لیکن ان کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ وہ بار بار کہتے کہ تم لوگ ناحق گھبرا رہے ہو۔ ان پر بعض اوقات یہ دَورے پڑا ہی کرتے ہیں۔ ہم دونوں یہاں موجود ہیں اور ان کے ہاتھوں کسی کو نقصان نہیں پہنچنے دیں گے لیکن عورتیں کسی طرح خاموش نہیں ہوتی تھیں چاروں طرف ایک ہنگامہ بپا تھا۔

سرا ما کی ماں نے اپنا ماتھا پیٹ لیا اور چیخ کر بولی۔ "لوگو میں نے اپنی بچّی کو بھاڑ میں جھونک دیا۔ میں نے اسے تاریک کوئیں میں پھینکدیا میں نے اسے تباہ کر دیا۔ اے پرماتما۔ میری بیٹی کی قسمت کیا اتنی ہی خراب تھی؟"

سرا ما کا باپ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ہر شخص پر کچھ ایسی وحشت اور خوف طاری تھا کہ کسی کو سرا ما کا خیال ہی نہ آیا۔ جب دیوانے کو کمرے سے باہر نکال دیا گیا۔ تو سب لوگوں کی توجہ بدقسمت دُلھن کی طرف مبذول ہوئی۔ اس نے اپنی ساڑھی کے کنارے کی گرہ دولھا کے لباس

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

کے کنارے سے کھول دی تھی اور کھڑکی کے سامنے خاموش کھڑی تھی۔

ایک نوجوان عورت لپک کر اُس کے پاس پہنچی اور کہنے لگی۔ کہ "ارے یہ کیا؟ یہ گرہ تم نے کیوں کھول دی ہے۔ کیا تمہیں خبر نہیں کہ یہ بُرا شگون ہے؟" سرامابولی۔ "تو ایسے شخص کے دامن سے بندھے رہنا ہی کون سا اچھا شگون ہے؟"

نوجوان عورت کسی قدر افسوس کے ساتھ بولی۔ "میری پیاری بہن! اب تم کر ہی کیا سکتی ہو۔ اب تم ایک شخص سے وابستہ ہو گئی ہو۔ اب اس سے تمہارا چھٹکارا ناممکن ہے۔ سچ مچ تم بڑی بدقسمت ہو۔"

دولہا کے دونوں نوکر کچھ دیر تک دولہا کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیتے رہے۔ اُنہوں نے اسے کچھ دوا بھی پلائی۔ جس سے وہ خاموش ہو گیا۔ اب دولہا میاں زمین پر لیٹ کر خراٹے لینے لگے۔ لیکن اب مہمان عورتوں کو نیند کہاں آتی تھی۔ سب نے رات بیٹھ کر کاٹ دی۔ وہ بیتاب تھیں کہ کب صبح ہو اور اپنے اعزہ و اقربا کو یہ دلچسپ داستان سنائیں۔

سراما کی ماں اُس کے پاس آ کر اُس کی پیٹھ پر تھپکیاں دے دے کر اُسے تسلیاں دینے لگی۔ لڑکی نے اپنے آپ کو اپنی ماں کی گرفت سے چھڑا لیا۔ اور اُٹھ کر کہیں اِدھر اُدھر چلی گئی۔

دُوسرے دِن دُلھن کو رخصت ہونا تھا۔ طرفین میں گرما گرم بحث چھڑ گئی سراما کے باپ نے چِلا چِلا کر کہنا شروع کیا۔ کہ میں ہرگز ان لوگوں کو اپنی لڑکی لے جانے نہ دونگا۔ انہوں نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ میں ان کے خلاف

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

مقدمہ چلاؤں گا۔ وُہ لے جائیں اپنے پاگل کو اپنے گھر یا پاگلخانے۔"

دولھا کی پارٹی تڑکی بہ تڑکی جواب دے رہی تھی۔ کہ اب تم بڑے بے خبر بن رہے ہو۔ کیا تمہیں پہلے سے بتا نہیں دیا گیا تھا۔ کہ دولھا میاں کبھی کبھی بیمار بھی ہو جایا کرتے ہیں۔"

سرلا کا باپ کہنے لگا۔" یہ بیمار کہاں ہے۔ یہ تو پاگل ہے پاگل۔ اِسے پاگل کہو۔ اس کی شادی کرنے سے تو بہتر تھا کہ تم لوگ اِسے کسی پاگل خانے میں بھیج دیتے۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ اسے کوئی معمولی سی بیماری ہوگی۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ یہ پاگل ہو جایا کرتا ہے۔ تو میں اس سے اپنی بیٹی کی نسبت نہ کرتا۔

اِدھر تو تو تُو مَیں مَیں ہو رہی تھی۔ اور اُدھر سرلا دولھا کے ساتھ جانے کے لئے لباس پہن رہی تھی۔ اس کا چہرہ ایک مورتی کی طرح مطمئن تھا۔ اس پر تشویش یا اضطراب کی کوئی علامات ہویدا نہ تھیں۔ یکایک وُہ باہر نکل آئی اور کہنے لگی۔" پتا جی! اب آپ اِن لوگوں سے لڑتے کیوں ہیں؟ جب آپ نے مجھے روپے کے عوض بیچ ڈالا۔ تو اب مجھے اِن لوگوں کے ساتھ چلے ہی جانا چاہیئے۔"

گاڑی مکان کے باہر کھڑی تھی۔ سب سے پہلے اس میں سرلا ہی سوار ہوئی دلوانہ دولھا بھی آ کر دُلہن کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل دی اور سرلا کے والدین کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

سرلا کو رخصت ہوئے سات دن گزر گئے۔ اور اس عرصے میں سرلا کی

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ماں دِن رات اپنی بیٹی کے لئے روتی رہی۔ جب انہیں سات دِن تک اپنی بیٹی کی کوئی خبر نہ ملی۔ تو سراما کا باپ اُسے ملنے کے لئے اس کے سُسرال روانہ ہو گیا۔ دو بار وہ سراما کے گھر گیا۔ لیکن دونوں مرتبہ رواج کے مطابق اپنی بیٹی سے اس کی ملاقات نہ ہو سکی۔ آٹھویں دِن رواج کے مطابق دولہا دولہن خود واپس آ گئے۔ اب کی مرتبہ دولہا صرف آدھ گھنٹہ یہاں ٹھہرنے کے بعد چلا گیا۔ جب تک وُہ یہاں رہا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

سراما کی ماں نے اپنی بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔ اور بھینچ بھینچ کر اسے پیار کرنے لگی۔ لیکن سراما بُت بنی ہوئی تھی۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہو گیا ہے۔ اُس نے شاندار قیمتی لباس زیبِ تن کر رکھا تھا۔ وہ سونے چاندی۔ موتیوں اور ہیروں سے لدی ہوئی تھی۔

ماں کہنے لگی۔ "میری پیاری بیٹی! مجھے امید ہے کہ اُس نے تم سے کوئی بدسلوکی نہیں کی ہو گی۔"

سراما کہنے لگی۔ "ایک دیوانہ بُرے اور بھلے سلوک میں کیا تمیز کر سکتا ہے؟"

ماں بولی۔ "لیکن تم نے اس کے ساتھ جانے کے لئے اِس قدر اصرار کیوں کیا۔ ہم تو ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ تمہیں اُس کے ساتھ بھیجیں۔"

سراما کہنے لگی۔ "جب آپ نے میرے خون اور میرے جسم کی قیمت وصول کر لی تھی۔ تو پھر میں کیوں نہ جاتی۔ میرا فرض تھا کہ میں اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیتی۔"

یہ کہکر وُہ کمرے سے اُٹھ کر چلی گئی۔

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

اڑوس پڑوس کی عورتیں بھی سراما کی آمد کی خبر سُن کر اُس کے گھر آ جمع ہوئی تھیں۔ اُن کی گفتگو کا موضوع بھی سراما کے زیورات تھا۔ وُہ صرف اس کے زیورات کے متعلق ہی باتیں کرتی رہیں۔ گویا ان کے نزدیک کوئی اَور بات قابلِ ذِکر ہی نہیں تھی۔

سراما بیٹھی ان عورتوں کی لایعنی باتیں سنتی رہی۔

جب عورتیں شام کو اپنے اپنے گھر چلی گئیں تو سراما اپنی ماں کے پاس آئی اَور کہنے لگی۔" ماتاجی! میں خالہ (اشتشودھر کی ماں) سے مِلنے جارہی ہوں۔ میں نے سُنا ہے کہ وُہ بہت بیمار ہے"۔

ماں کہنے لگی۔"لیکن بچی وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہرنا"۔

لیکن سراما بہت دیر بعد واپس آئی۔ جب وُہ آئی تو گھڑی نے ٹن ٹن دس بجائے۔ اس کی ماں بستر پر دراز ہو چکی تھی۔ کہنے لگی۔" بیٹی نہ معلوم تم نے اتنی دیر کیوں کر دی۔ مارے فکر کے میری تو جان نکلی جا رہی تھی۔ اس لئے کہ تم نے بہت سا زیور پہن رکھا تھا"۔

سراما بولی" مَیں چند اَور گھروں میں چلی گئی تھی۔ ان سب نے مجھے کھانا کھانے پر مجبور کیا۔ اور آج میں نے اس قدر کھا لیا ہے۔ کہ بالکل بھوک نہیں رہی"۔

یہ کہکر وُہ بستر پر لیٹ گئی اَور چادر تان کر سو گئی۔

دوسرے دِن گھر میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ سراما کے تمام زیورات غائب تھے۔ صرف ہاتھی دانت کی چوڑیاں باقی تھیں۔ سراما کے لب پر مہرِ سکوت لگ

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

گئی تھی۔ ماں باپ نے اُسے اَن گنت گالیاں دے ڈالیں کہ بتاؤ زیورات کہاں ہیں۔ لیکن اس کی مُہرِ سکوت نہ ٹوٹی۔ آخر اُسے خوب پیٹا گیا۔ لیکن پھر بھی اس نے نہ بتایا کہ زیورات کہاں گئے۔

اسکی ماں زار و قطار رونے لگی۔ "اگر تم نہیں بتاؤ گی کہ زیورات کہاں گئے تو ہم اُن کا کھوج کس طرح نکالیں گے۔ وُہ لوگ تو تمہیں جان سے مار ڈالیں گے۔ آٹھ ہزار روپے کا زیور تھا۔ دو ڈھائی سَو کا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ بولو بولو۔ پرماتما کے لِئے بولو کہ زیورات کہاں گئے۔"

سرامَا کہنے لگی۔ "اس معاملے کا تعلق صرف مجھ سے ہے۔ ان لوگوں نے اپنے دیوانے لڑکے کے لیئے آٹھ ہزار روپے میں ایک لونڈی خریدی ہے اتنی بیش قیمت لونڈی کو وُہ کس طرح قتل کرینگے۔"

سرامَا کی داستان ختم ہو گئی۔

ششو دھر کو اپنی ماں کی طرف سے ایک خط موصول ہوا۔ جس میں لکھا تھا کہ بیٹا میں اب تک سخت بیمار ہوں۔ اس لِئے تمہیں کوئی خط نہ لکھ سکی ہیرے لال! پرماتما نے اب ہمارے حال پر بڑی دیا کی ہے۔ جائداد گروی رکھ کر ہم تو بالکل بھکاری ہو گئے تھے۔ بہت ممکن تھا کہ ہیں۔ راہ میں ہم گھر سے بے گھر ہو کر گلیوں میں مارے مارے پھرتے۔ معلوم نہیں کس دیوتا کو ہمارے حال پر رحم آگیا ہے۔ مہاجن نے ہمارا گھر جو اس کے پاس گروی تھا۔ چھوڑ دیا ہے۔ اور بقیہ رقم کا مسک بھی واپس کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے میرا

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

روپیہ مِل گیا ہے۔ لیکن وہ کسی طرح بھی اس آدمی کا نام نہیں بتاتا۔ جس نے ہماری طرف سے اُسے روپیہ ادا کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مَیں نے اس شخص سے وعدہ کر رکھا ہے۔ کہ میں اس کا نام کسی سے ظاہر نہ کرونگا۔ میرے پیارے بچے! تمہیں یہ کہانی خواب کی طرح معلوم ہوگی۔ مگر ہے حرف بحرف سچ!

بچاری سمرا کو آما چند روز ہوئے۔ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اس کے باپ نے اس غریب کی زندگی تباہ کر ڈالی ہے۔ اس کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی گئی ہے جو پاگل ہے۔ محض اس لیئے کہ اُس نے ان لوگوں کو کچھ رقم دے دی تھی ۔

شاعرِ رومان راجہ مہدی علیخان صاحب کے نادرِ زمانہ شاہکار!

دُنیا کی رنگین مزاج عورتیں یہ کتاب دُنیا کی مشہور و معروف شہزادیوں اور ملکاؤں کے عشقیہ داستانوں پر مشتمل ہے اسکے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہو گا کہ عورت خواہ ملکہ ہی کیوں نہ ہو محبت سے مجبور ہو کر ایک حبشی کے قدموں پر بھی سر رکھ دیتی ہے کتاب کی نثر پر نظم کا گمان ہونے لگتا ہے قیمت مجلد عا/

ستارۂ صبح دنیا کے ہر ملک کے بہترین افسانہ نگاروں کا ایک ایک افسانہ منتخب کر کے اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کا ایک ایک افسانہ آپ کو عشق و محبت کی مہکی ہوئی وادیوں کی سیر کرائے گا۔ قیمت مجلد کتاب عا/

کملا بنگالی زبان کے مشہور ناول "بارواری" کا اُردو ترجمہ ہے۔ اور بنگال کے بارہ مشہور مصنفوں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ ناول اردو ادب میں اپنی طرز کا نرالا اور پہلا شاہکار ہے۔ ایک مرتبہ اِسے شروع کر دیں گے تو ختم کئے بغیر آپ کو چین نہیں آئیگا۔ یہ پاکیزہ محبت کی داستان ہے جس میں آہوں آنسوؤں اور مسکراہٹوں کا طوفان آپکو عجیب فضا میں لے جائیگا۔ قیمت مجلد کتاب ع/

بنگال کی جادو نگار ادیبہ سیتا دیوی چیٹرجی کے شاہکار

کاروانِ حیات۔ بنگال کی جادو نگار ناول نویس سیتا دیوی کا ایک نہایت پاکیزہ

ملنے کا پتہ:- نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجرانِ کتب لاہور

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

ناول جسے جمیل احمد کندھاپوری نے شگفتہ اُردو کا لباس پہنایا ہے۔ حُسن و عشق کی رنگینی کے باوجود یہ ناول اِس لائق ہے کہ ایک بھائی اسے بلا جھجک اپنی بہن کو پیش کر سکتا ہے۔ قیمت صرف دو روپے (عه)

جنت و جہنم۔ بنگال کی مشہور افسانہ نویس خاتون سیتا دیوی کے آٹھ بہترین معاشرتی افسانوں کا مجموعہ۔ جن میں واقعات کی تلخی بھی ہے۔ اور رومانیت کی رنگینی بھی۔ جناب جمیل احمد کندھاپوری نے اس قابلیت سے اِن افسانوں کو اردو کے سانچوں میں ڈھالا ہے۔ کہ نقل پر اصل کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اُردو میں افسانوں کا ایسا پاکیزہ مجموعہ آج تک شائع نہیں ہوا۔ قیمت صرف ۱؎

آنسو۔ بنگال کی جادو نگار افسانہ نویس سیتا چیٹرجی کا بیدار تخئیل ایک حسین ناول کے روپ میں۔ غم و فراق کی لے چین کروٹیں اور یاس و حرمان کے مضطرب نالے ایک اچھوتی کتاب کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔ مترجمہ سید احسان بی۔ اے (آنرز) قیمت صرف عه

ادیب الملک میرزا ادیب بی۔ اے کی غیر فانی تصانیف

صحرا نورد کے رُومان۔ جن حضرات نے صحرا نورد کے خطوط پڑھے ہونگے۔ وہ کبھی اِس غیر فانی شاہکار کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ رنگین دلچسپ اور دلآویز کتاب قیمت ہیرے موتی کا ہار اگر آپ ان افسانوں کو پڑھکر محسوس کرینگے۔ کہ آپ افسانوں ہی کی دنیا میں حرکت کر رہے ہیں۔ دوسرا ایڈیشن تیار ہے۔ قیمت مجلد ۶؎

ملنے کا پتہ:۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز اندرون لوہاری دروازہ لاہور

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri

CC-0 In Public Domain. Digitzed by eGangotri